نورتن
شورش کاشمیری

نورتن
لاہور کے نُو صحافیوں کا اجمالی تذکرہ

شورش کاشمیری

اشاعت اول

جون ۱۹۶۷ء

تعداد.......................... گیارہ سو

مطبع ....چٹان پرنٹنگ پریس ۔ لاہور

ناشر ....مطبوعات چٹان ۔ لاہور

قیمت پانچ روپے

* عبدالمجید سالک
* چراغ حسن حسرت
* مہاشہ کرشن
* سید حبیب
* مرتضیٰ احمد میکش
* اظہر امرتسری
* حاجی لق لق
* ابو صالح اصلاحی
* مجید لاہوری

مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ

۸۸۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

فہرست

تمام زندگی میں صرف دو راتیں
میں نے مطالعہ کتب کے بغیر
گذاری ہیں۔ پہلی رات جب میری
شادی ہوئی۔ دوسری رات جب
میرے والد رحلت فرما گئے۔

ابن رشد

اِنتساب

بہت کم لوگوں کی تحریریں متاثر کرتی ہیں۔
پچھلے پینتیس برس میں جن اہل قلم کا میں نے
مطالعہ کیا ہے ان میں گنے چنے لوگ ہوں گے۔
جنھوں نے مجھے متاثر کیا۔ یا جن کے چمنستان نگارش
میں میرے قلم نے گلگشت کی ہے۔ ان میں
دو شخصیتیں واضح طور پر ایسی ہیں جن میں
سے ایک کا جادو خود میرے افکار پر چھایا ہوا ہے
اور وہ ہیں مولانا ابوالکلام آزادؒ ـــــ دوسری شخصیت پروفیسر
رشید احمد صدیقی کی ہے۔ جن کے طرز تحریر میں صدیق اکبر کی للھیت
فاروق اعظم کی سطوت، عثمان غنی کی حیا اور علی مرتضیٰ کی شجاعت
پائی جاتی ہے۔ ان کے خیالوں کی سلطنت میں ابو ذرغفاری کا فقر ہے۔

ان اوراق میں اس فقر ہی کے دروازے پر دستک دی ہے ـــــ

ادیب العصر

پروفیسر رشید احمد صدّیقی کے نام

لاہور
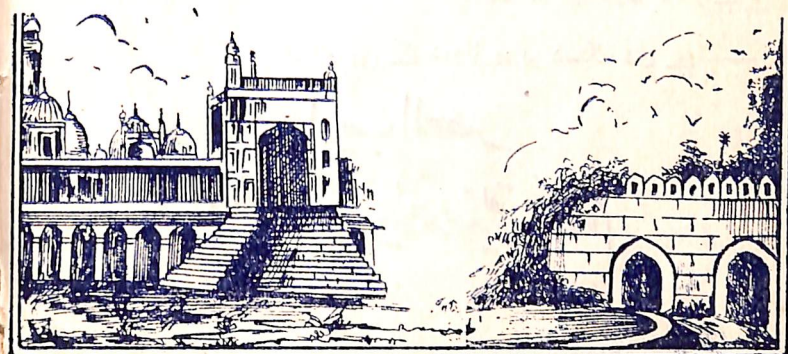
۲۵ جون ۱۹۶۷ء

شورش کاشمیری

کوئی

پینتیس برس پہلے میں نے ادبیات و سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا تھا ۔ اس عرصہ میں بے شمار شخصیتوں سے واسطہ پڑا ۔ ادبی و سیاسی ، دینی و تہذیبی ، راہنماؤں کی ایک بڑی تعداد سے ہم سخنی و ہم صحبتی رہی ۔ چند ایک کو چھوڑ کر شاذ ہی کوئی راہنما ہو گا جس سے مراسم نہ رہے ہوں ۔ مراسم کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں ۔ ان میں ایک شکل نیاز مندی کی بھی ہے ۔ اس پوری کھیپ میں استثنیٰ کے سوا کوئی شخصیت ایسی نہیں جس نے دماغ و دل سے نیاز مندی کا مطالبہ کیا ہو ، رہا قلم کی فیاضیوں

کوئی پینتیس برس پہلے میں نے ادبیات و سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا تھا ۔ اس عرصہ میں بے شمار شخصیتوں سے واسط پڑا ۔ ادبی و سیاسی ، دینی و تہذیبی ، راھنماؤں کی ایک بڑی تعداد سے ہم سخنی و ہم صحبتی رہی ۔ چند ایک کو چھوڑ کر شاذ ہی کوئی راہنما ہو گا جس سے مراسم نہ رہے ہوں ۔ مراسم کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں ۔ ان میں ایک شکل نیاز مندی کی بھی ہے ۔ اس پوری کھیپ میں استثنیٰ کے سوا کوئی شخصیت ایسی نہیں جس نے دماغ و دل سے نیاز مندی کا مطالبہ کیا ہو ، رہا قلم کی فیاضیوں

کا سوال تو اس کا معاملہ دوسرا ہے۔ شاعر، ادیب، صحافی، اور خطیب الفاظ کے بارے میں فطرۃً سخی واقع ہوئے ہیں خود مجھے اپنی اس فیاضی کا اعتراف ہے ——— رہا سوانحی خاکوں کا سوال تو میری یہ کوشش رہی ہے کہ جو کچھ لکھوں ناپ تول کر لکھوں اسی لئے جو کچھ دیکھا۔ جس طرح دیکھا اور جس رنگ میں کسی کو پایا، ہو بہو اُسی طرح بیان کر دیا ہے۔ انسانی سیرت کے معاملہ میں بخل یا فیاضی دونو ہی خطرناک ہیں۔ بخل سے خود ادیب کی روح ہلاک ہو جاتی ہے اور فیاضی اس کے طرز تحریر کو ساقط الاعتبار کر دیتی ہے۔

اس کتاب میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ لاہور کے نو مختلف صحافی ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو طبعی عمر گذار کر خالق حقیقی سے جا ملے اور وہ عزیز بھی ہیں جن کا پیمانۂ عمر قبل از وقت لبریز ہو گیا۔ مولانا ظفر علی خاںؒ متقدمین میں اُستاذ العصر تھے۔ ان کے سوانحی افکار پر میری ایک الگ کتاب موجود ہے۔ اس زمانے میں صحافت کی نوجوان پود کے میر قافلہ حمید نظامی تھے۔ ان کے متعلق بھی علیحدہ کتابچہ لکھ چکا ہوں۔ مولانا ظفر علی خاںؒ کے عہد میں جن لوگوں نے اخبار نویسی کا ڈول ڈالا اور اپنے دوائر میں ممتاز ہو گئے۔ پھر اس زمانے میں جن نوجوانوں نے قلم سے رشتہ استوار کیا مگر اپنی چھاپ لگائے بغیر واصل بحق ہو گئے۔ "نو رتن" ان کی سیرتوں کا عکس ہے۔

آشنا ہستیوں کے بارے میں قلم اٹھانا آسان نہیں۔ پھر مرحومین

کے بارے میں یہ کام اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ مذاق عام ہو گیا ہے کہ بیشتر لوگ مرنے والوں کے حسن و قبح پر بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ مدح پر اُتر آئیں تو ان کے محاسن کا رشتہ پیغمبروں سے جا ملاتے ہیں۔ قدح مقصود ہو تو گور و کفن کی چیر پھاڑ بھی اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں۔ میں نے اب تک جو کچھ بھی لکھا۔ مدح و قدح کے اس عام شیوہ سے ہٹ کر لکھا محاسن کو معجزہ قرار نہیں دیا حالانکہ بعض محاسن پر معجزہ ہونے کا گمان بھی ہوتا ہے۔ قبائح کو نشر نہیں کیا لیکن ناگزیر حقیقتوں کو چھپایا بھی نہیں۔ انسان کی سیرت بہر حال حسن و قبح کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر انسان کی زندگی گنہگار ہو تاہم انسان خطا کار ضرور ہے اس میں کوتاہیاں بھی ہیں اور کمزوریاں بھی۔ میں نے متاع حسن کو اُجالنے کے لئے عشق کی آوارگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ نتیجۃً بعض خاکوں میں حسن یار شہابی سے شرابی ہو گیا ہے۔

اس تذکرے میں جو لوگ شامل ہیں اُن سے اپنے تعلقات کی نوعیت میں نے ان خاکوں میں واضح کر دی ہے۔ احترام کے حدود تو ہر جگہ ہوتے ہیں جن "بڑوں" کا ذکر کیا ہے۔ ان کے معاملہ میں ان حدود کا خیال رکھا ہے۔ لیکن خوردوں کے معاملہ میں بھی بالا ہونے کی کوشش نہیں کی۔ دونو کی تصویریں جہاں تک مشاہدے، مطالعے اور تجربے کا تعلق ہے اُن کے خدو خال ہی کے مطابق پیش کی ہیں البتہ ایک بات جو آپ ان خاکوں کے مطالعہ سے محسوس

کرینگے وہ ان بزرگوں اور خوردوں سے بے تکلفی ہے - سوانح نگار
کے سامنے بہت سے حدود ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ ایک انسان میں
سفر کرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اسے جادہ و منزل کے بہت سے حدود کا
احترام کرنا پڑتا ہے - پھر ہر سفر کے خاص آداب ہوتے ہیں - ایک سوانح
نگار ان آداب کو ملحوظ نہ رکھے تو اس کا سفر ہی بدمزہ ہو جاتا ہے -
لیکن خاکہ نویس کی مثال مصور سے زیادہ فوٹوگرافر کی ہے - وہ اپنے
فن میں مخلص ہو تو ہر تصویر کو اس کے صحیح خطوط کے ساتھ
پیش کر دیتا ہے - لیکن اس کا کام کسی تصویر کو سجانا نہیں -
بلکہ جو چیز موجود ہے اُس کو جزیات کے ساتھ جوں کا توں پیش کر
دینا ہے - لیکن جزیات کیمرے کی ———— انشاء کی نہیں ؟

نو رتن میں یہی اسلوب ملحوظ رکھا گیا ہے - کسی فرد کے
سر پر خواہ مخواہ دستار فضیلت نہیں باندھی - کسی کے سینہ پر
تمغۂ فضیلت نہیں لٹکایا - کسی کو ثریا کا باشندہ نہیں کہا اور نہ
کسی کو ثریٰ میں گرایا ہے - انسانوں کے خاکے ایک انسان ہی کی
حیثیت سے لکھے ہیں - کسی مخفی خواہش یا سیاسی آلودگی سے قلم
کو مجروح نہیں کیا - - - - - - - - - !

مرحومین کے بارے میں قلم اٹھاتے وقت میں یہ احتیاط ضرور
کر لیتا ہوں کہ ان کی روحوں کو اذیت نہ پہنچے - مجھے قارئین کے
چٹخارے سے زیادہ ان روحوں کا احترام ملحوظ رہتا ہے -

میں عقیدوں کے معاملہ میں سمجھوتا نہیں کرتا اور نہ اپنے
معتقدات ہی کو ترک کرتا ہوں - لیکن جہاں تک افراد کی ذاتیات کا

تعلق ہے جب تک ان میں اجتماعی شر نہ ہو مجھے ان سے کوئی تعرض نہیں ہوتا۔ اس کتاب کے "نو رتن" انسان ہی تھے۔ ان میں انسانوں کے سے عیب بھی تھے اور ھنر بھی۔ بعض کے ساتھ بہت سوں کو اختلاف رہا۔ انہوں نے بھی بے شمار لوگوں سے اختلاف کیا۔ صحافت آئینہ خانہ ہی نہیں شفا خانہ بھی ہے اور قصاب خانہ بھی۔ بلکہ فی زمانہ نگار خانہ بھی۔ ان لوگوں نے عمر بھر جرح و قدح کی۔ کئی اس فن میں اتارو تھے۔ کہ عماموں پر ھاتھ بڑھائیں۔ قباؤں کے ٹانکے توڑیں ان کا شغل ہی مزاح و تفنن رہا۔ ظاہر ہے کہ مزاح و تفنن کی پرواز اخبار نویسی میں بے قابو ہو تو اس سے ھجو کو سہارا ملتا اور دشنام کا راستہ کھلتا ہے۔

جب ان لوگوں کے قلم کا شعار ہی چیر پھاڑ رہا ——— نظریات سے لے کر شخصیات تک! تو خود ان کے لئے نقد و نظر کا آمیختہ چنداں عیب نہیں۔ شاخوں پر پھول بھی ہوتے ہیں۔ پتیاں بھی۔ اور کانٹے بھی۔ میں نے پھول نمایاں کر دئے ہیں پتیاں حسن کو ملیح کرنے کے لئے ساتھ رکھی ہیں۔ کانٹوں کو توڑا نہیں۔ مبادا قلم کی پوریں گلرنگ ہو جائیں۔ چھیڑا بھی نہیں۔ البتہ جہاں پھول کو نظر بد سے بچانا چاھا۔ وھاں کانٹا رہنے دیا ہے ——— زندگی صرف محاسن ہی کا مجموعہ ہو تو مصحف ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک رند لا اُبالی مصحف کو ھاتھ لگاتے ہوئے ضرور خوف زدہ ہوتا ہے اس کے برعکس زندگی میں میکدے کی رنگینی اور بتکدے کی سنگینی بھی ہو تو زندگی بشریت سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔

ان نو سوانحی خاکوں میں منبر و محراب کے سجدہ ہائے ناز بھی ہیں۔ اور شاہد و شراب کے راز و نیاز بھی۔ ذوق کی تصویریں ہیں شوق سے پڑھئے۔ حسن محسوس ہو تو دعائے خیر سے یاد کیجئے۔ زشت معلوم ہو تو استغفار پڑھئے۔ بعض اوقات معلم الملکوت بھی قلم کو بہکا دیتا ہے۔ خیال میرا یہی ہے کہ میں نے اس میں حسن کو جمع کیا ہے۔ اب اگر "پرشش جراحت دل" کا حوصلہ کیا ہے تو "سامان صد ہزار نمکدان" بھی ہونا چاہئے۔ غالب نے تو معاصرت کے فتنوں سے یہ کہہ کر دامن بچا لیا تھا ـــــــ ع

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن میرا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ غالب ہی کے الفاظ میں

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

لیجئے کتاب حاضر ہے۔

لاہور
۸ جون ۱۹۶۷ء

شورش کاشمیری

ایک بات اور

میں نے یہ کتاب فروری ۱۹۶۵ء میں شروع کی تھی۔
اس کے لئے کسی خاص تیاری کی ضرورت ہی نہ تھی۔
معاً ایک تحریک سی ہوئی قلم اٹھایا ہفتہ عشرہ میں
نصف کتاب تیار ہوگئی۔ پھر طبیعت رکی تو تعطل سا
پیدا ہوگیا۔ ہفتہ وار چٹان کی گونا گوں مصروفیتیں
کہاں فرصت دیتی ہیں کہ ان کاموں میں دلجمعی سے
حصہ لوں۔ شروع ستمبر میں سوچ رہا تھا کتاب کے باقی
حصے مکمل کر لوں کہ چھ ستمبر کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان
جنگ ہوگئی۔ ذہن اس طرف منتقل ہو گیا۔ جنگ سترہ روز کی تھی

سترہ ہفتے اسی کے برگ و بار پر غور کرتے ہوئے نکل گئے۔ فروری ۱۹۶۶ء کے وسط میں دوبارہ ارادہ کیا لیکن جانے کیا پیچ آ پڑا کہ رشتۂ تحریر کوشش کے باوجود ہاتھ نہ آیا ۔ میں نے دوسرے مسودوں کی طرح اس مسودے کو بھی اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا ——
گرمی کا موسم میرے لئے نہایت پریشان کن ہوتا ہے ۔ مارچ سے اگست کے اواخر تک چٹان ہی کا ہو رہا ۔ شروع ستمبر میں طبیعت کو آمادہ پایا تو چھ ستمبر کو رات کے آغاز میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۳۲ میں گرفتار ہو گیا ۔ تین ماہ سترہ روز نظر بند رہا ۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۶ کو یہ بندھن بھی ٹوٹ گئے ۔ لیکن طبیعت کا انجماد علالت کے باعث قائم رہا ۔ اب کے طبیعت معمول کے خلاف شروع مئی ہی میں شگفتہ ہوگئی ۔ مسودہ نظر پڑا ۔ جن صحافیوں کا تذکرہ باقی تھا ایک ہفتہ کے اندر اندر تیار ہو گیا ۔ بظاہر قلم کا یہ سفر دو سال اور پانچ ماہ میں طے ہوا لیکن حقیقۃً اس کتاب کو لکھنے میں صرف دو ہفتے لگے ہیں ۔

بہر حال جو کچھ بھی ہے آپ کے سامنے ہے ۔

لاہور
۵ جون ۱۹۶۷ء

شورش کاشمیری

عبدالمجید سالک

ہوش کی آنکھ کھولی تو گھر بھر میں مولانا ظفر علی خاںؒ کا
چرچا تھا "زمیندار" کی بدولت خاص قسم کے الفاظ زبان پر چڑھے
ہوئے تھے انہی الفاظ میں ایک ٹوڈی کا لفظ بھی تھا "زمیندار نے
اسکو اتنی وسعت دے دی تھی کہ مولانا ظفرعلی خاں کے اپنے الفاظ
میں راس کماری سے لیکر سری نگر تک اور سلہٹ سے لیکر خیبر تک
اس لفظ کا غلغلہ مچا ہؤا تھا، جس شخص کا ناطہ بالواسطہ یا بلاواسطہ
برطانوی سرکار سے استوار تھا وہ فی الجملہ ٹوڈی تھا، اس زمانہ میں
ہمیں سیاسیات کے پیچ و خم سے کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی، ہم نے
ٹوڈی کے مفہوم کو اور بھی محدود کر رکھا تھا، وہ تمام لوگ

جو مولانا ظفر علی خاں کے مخالف تھے یا جنہیں مولانا سے اختلاف تھا ہمارے نزدیک ٹوڈی تھے،

اب چونکہ انقلاب کے دونو مدیر (مہر و سالک) زمیندار کے مقابلہ میں تھے اور مولانا سے کٹ کے انقلاب نکالا تھا، لہذا ہمارے نزدیک ان کا عرف یا تخاص بھی ٹوڈی تھا، پھر یہ ہفتوں یا مہینوں کی بات نہ تھی، برسوں تک یہی خیال ذہن پر نقش رہا حتیٰ کہ ایک دھائی بیت گئی، دوسری دھائی کے شروع میں یہ لفظ کسی حد تک کجلا گیا، اور اس کی جگہ بعض مستور الفاظ رواج پا گئے، مثلاً رجعت پسند، کاسہ لیس وغیرہ، ان الفاظ میں دشنام کی بد مزگی تو نہ تھی لیکن حقارت کا مخفی اظہار ضرور تھا، بالآخر ان ھجویہ الفاظ کا زور بھی ٹوٹ گیا، یہ تمام الفاظ پھلجڑی کا سماں باندھ کر ٹھنڈے پڑ گئے، جن تحریکوں کے ساتھ ان کا شباب تھا ان کے ختم ہوتے ہی ان کی رونق بھی مرجھا گئی، اور ان کا تذکرہ سیاسی افکار کے عجائب گھروں کی زینت ہو گیا،

اس دوران سالک صاحب سے کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں، دفتر زمیندار ہی میں ان سے تعارف ہوُا لیکن اس تعارف سے صرف علیک سلیک کا راستہ کھلا، وہ اپنی ذات میں مستغرق تھے ہم اپنے خیال میں منہمک، تاثر یہی رہا کہ سالک صاحب ٹوڈی اور انقلاب ٹوڈی بچہ ہے،

سالک صاحب ہمیں کیا رسید دیتے وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ادھر زمیندار نے ہمیں یہاں تک فریفتہ کر

رکھا تھا کہ انقلاب کو ہم نے خود ہی ممنوع قرار دے لیا تھا،
پانچ سات برس اسی میں نکل گئے، دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی
تو لمبی لمبی قیدوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ہم کوئی دس گیارہ
نوجوان منٹگمری سنٹرل جیل میں رکھے گئے، سخت قسم کی
تنہائی میں دن گذارنا مشکل تھا، قرطاس و قلم موقوف، کتب و
رسائل پر قدغن، جرائد و صحائف پر احتساب، یہاں تک کہ عزیزوں
کے خط بھی روک لئے جاتے، وحشتناک تنہائی کا زمانہ، جیل کے
افسروں سے بارہا مطالبہ کیا کہ اخبار مہیا کریں لیکن ہر استدعا
مسترد ہوتی رہی، جب پانی سر سے گذر گیا تو ہم نے بھوک ہڑتال
کر دی، نتیجۃً حکومت کو جھکنا پڑا، ''سول'' اور ''انقلاب''
ملنے لگے، ہماری وارڈ کا انچارج ایک مذہبی سکھ سردار شیر سنگھ
تھا، کالا بھجنگ، بد ہیئت، اور بد رو، قیدیوں کو ستانے میں
اسے خاص لطف محسوس ہوتا، یہی اس کی خصوصیت تھی، چونکہ
اخبار اس کی مرضی کے خلاف ملے تھے اور اسے سنسر کرنے کا اختیار
تھا، لہذا ہر روز اخبار کے مختلف صفحے قینچی سے اس طرح کاٹتا
کہ سارا اخبار بے مزہ ہو جاتا، سیاسی خبریں تو بالکل ہی کٹ
کے آتی تھیں، یہی زمانہ تھا جب افکار و حوادث سے روزمرہ کی
دلچسپی پیدا ہوئی، شیر سنگھ کو پتہ چلا کہ افکار و حوادث
با جماعت پڑھے اور سنے جاتے ہیں تو اس نے افکار و حوادث کاٹنا
شروع کئے پہلے دن ہمارا خیال تھا کوئی سیاسی خبر کاٹی ہو گی،
جب ہر روز قینچی چلنے لگی تو ہم نے شیر سنگھ کو متوجہ کیا،

وہ معمول کے مطابق طرح دے گیا ، ہم نے احتجاج کیا اس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا ، ہم نے بھوک ہڑتال کی دھمکی دی ، وہ مسکرا کے ٹال گیا ، آخرکار بھوک ہڑتال کی نیو اٹھائی تو وہ اگلے ہی روز پسپا ہو گیا ، افکار و حوادث مقراض سے محفوظ ہو گئے ، بظاہر یہ ایک لطیفہ تھا کہ جس اخبار کو ہم سرکاری مناد سمجھتے اور جس کالم میں قومی تحریکوں یا قومی شخصیتوں پر سب سے زیادہ پھبتیاں کسی جاتی تھیں ہم نے اسے بھوک ہڑتال کر کے حاصل کیا ،

غرض افکار و حوادث کی ادبی دلکشی کا یہ عالم تھا کہ ہم اس کی چوٹیں سہہ کر لطف محسوس کرتے ، سیاسی تاثر تو ہمارا وہی رہا جو پہلے دن سے تھا لیکن اس کی ادبی وجاہت کے شیفتہ ہو گئے ، مہر صاحب کے اداریے ایک خاص رنگ میں ڈھلے ہوتے ، ان میں تحریر کی دلکشی اور استدلال کی خوبی دونو کا امتزاج تھا ، سالک صاحب افکار و حوادث میں مطائبات کی چاشنی اور طنزیات کی شیرینی اس طرح سموتے تھے کہ جی باغ باغ ہو جاتا ، محسوس ہوتا گویا ہم میکدے میں ہیں کہ رندان درد آشام تلخ کام ہو کر بھی خوش کام ہو رہے ہیں

ساتھیوں کا ایک مخصوص گروہ تھا ، جس میں جنگ کی وسعتوں اور شدتوں کے باعث اضافہ ہوتا رہا ، میں منٹگمری سنٹرل جیل سے تبدیل ہو کر لاہور سنٹرل جیل میں آ گیا ، تو پہلا مسئلہ انقلاب ہی کے حصول کا تھا ، سید امیر شاہ (جیلر) کی بدولت فوراً ہی انتظام ہو گیا ، غرض قید کا یہ سارا زمانہ انقلاب سے

آشنائی میں کٹ گیا ، رہا ہوا تو سالک صاحب سے انکے دفتر
میں جا کے ملا ، مہر صاحب اس وقت موجود نہیں تھے ، اور نہ
ان سے کھلا ڈلا تعارف تھا ، سالک صاحب تپاک سے ملے ، یہ
سن کر انہیں تعجب ہوا کہ پانچ سال قید کٹوانے کے باوجود سرکار
نے مجھے تھانہ انارکلی کے حدود میں نظر بند کر دیا اور تحریر و تقریر
پر پابندی لگا دی ہے اُنہوں نے اگلے ھی روز شذرہ لکھا جس میں
حکومت کو مشورہ دیا کہ ان ناروا پابندیوں کو واپس لے لے ،
گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی اس ملاقات میں وہ پھلجڑیاں چھوڑتے رہے ،
باتوں کو سنوارنا ، گفتگو کو تراشنا اور ان سے لطائف نکالنا
انکی طبعیت کا وصف خاص تھا ، اس معاملہ میں انکی تقریر ، تحریر
سے زیادہ دلفریب ہوتی ، انسان اُکتاتا ھی نہیں تھا ، ایک آدھ دفعہ
پہلے بھی یہ مشورہ دے چکے تھے اور اب کے بھی یہی زور دیتے
رہے کہ سیاسیات میں اپنے آپ کو ضائع نہ کرو ، صلاحیتوں سے
فائدہ اُٹھاؤ اور کتاب و قلم کے ہوجاؤ ۔ اب جو ان سے تعلقات بڑھنے
لگے تو دنوں ہی میں بڑھ کے وسیع ہوگئے ،، یہ زمانہ انگریزی
حکومت کے ہندوستان سے رخصت ہونے کا تھا ، برطانوی سرکار کے
آخری دو سال تھے ، احرار نے روزنامہ آزاد نکال رکھا تھا ،
,, انقلاب ،، پنجاب کے مسلم لیگی لیڈروں کی مرضی کے مطابق
نہ تھا ، لہذا معتوب تھا ،

تمام ملک میں فساد و انتشار سے آگ لگی ہوئی تھی اس
افراتفری کے دنوں ہی میں سالک صاحب سے میل ملاقات کے

مزید راستے کھلے خلوت و جلوت میں انکا اندازہ ہونے لگا سیاسیات سے قطع نظر یہ بات ذہن میں آ گئی کہ وہ ہمارے مفروضہ سے مختلف انسان ہیں بلکہ خوب انسان ہیں یہ بات بری طرح محسوس ہوئی کہ بعض لوگ مستعار عصبیتوں کی وجہ سے بدنام ہوتے ہیں ، اور انسان بلا تجربہ اپنے دماغ میں مفروضے قائم کر کے انہیں حقیقتیں بنا دیتا ہے ، لیکن جب یہی لوگ تجربہ یا مشاہدہ میں آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پاسنگ کا سونا ہیں ، اسکے برعکس بہت سے لوگ تجربہ و مشاہدہ میں آنے کے بعد دور کا ڈھول نکلتے ہیں ، انکی ہم صحبتی ان کے خط و خال کو آشکار کر دیتی ہے ،

سالک صاحب کو مستعار عصبیتوں سے دیکھا تو انکی شگفتہ تصویر نہ بن سکی ، یہی باور کیا کہ خوان استعمار کے زلہ ربا ہیں ، قریب سے دیکھا تو ایک روشن تصویر نکلے ، سید عطا اللہ شاہ بخاری فسادات میں امرتسر کے طوفانوں سے نکل کر لاہور میں تھے اُنھوں نے اس تصویر کو اور بھی چمکا دیا ، ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

اُنہیں سالک سے ملے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے لاہور میں انکے قیام کی بدولت دفتر احرار میں میلہ سا لگا رہا ، یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ برس جاری رہا ، اس سارے عرصہ میں سالک صاحب کا ذکر بھی کئی دفعہ آیا بلکہ آتا ہی رہا ، شاہ جی ان سے کٹی کٹے ہوئے تھے لیکن ان کی تعریف کرتے ، اور اس تعریف میں یہاں تک فیاض تھے کہ سالک کی قسمیں کھاتے ، مثلاً فرماتے کہ اُسکی جوانی بے داغ

رہی ہے وہ ایک شریف انسان ہے ، اس میں ایک ادیب کا حسن ہے اسکو اخبار نویسی کے داؤں بیچ آتے ہیں ، وہ قابل اعتماد دوست ہے ، وہ دغاباز نہیں اسکے نفس نے کبھی خیانت نہیں کی وغیرہ اور جب اُن سے کوئی شخص یہ کہتا کہ آپ نے اُن کے ساتھ اتنے برس سے بول چال کیوں بند کر رکھی ہے تو شاہ جی آبدیدہ ہو جاتے ، فرماتے میں نے تعلقات کا انقطاع نہیں کیا ، اس نے خود کنارا کیا ہے

اور جب یہ عرض کرتے کہ آپس میں صلح صفائی کر لیجئے تو ذرا ترش ہو جاتے ، فرماتے ، جی نہیں میں اس سے قیامت تک نہیں بولوں گا ، اس نے میرا دل دکھایا ہے ، میں اس کو کیونکر معاف کر سکتا ہوں ، مجھے اس کے بچھڑ جانے کا قلق ہے ، قلم سے جو نشتر اُس نے لگائے ہیں دل کا ناسور ہیں یہ اسی کا بویا ہوا ہے جو ہم کاٹ رہے ہیں اور وہ خود بھی کاٹ رہا ہے ۔ سالک صاحب سے تذکرہ ہوتا کہ شاہ جی آپ کے بارے میں یہ کہتے ہیں تو وہ بھی خفی خواہش کو دبا جاتے ، فرماتے کہ شاہ‌جی تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں بھلا یہ عمر اب طعنے مہنوں کی ہے ، دونو طرف دلوں میں صلح صفائی کی اُسنگ موجود تھی ، لیکن دونو کو بارش کے پہلے قطرے کا انتظار تھا ، آخر ایک روز برکھا ہو گئی ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے شاہ جی کو دفتر احرار سے اُٹھایا اور احمد شاہ بخاری (پطرس مرحوم) کی کوٹھی پر لے گئے ، وہاں سالک صاحب پہلے سے موجود تھے ، صورت حال یہ تھی ۔

وہ ہم سے خفا ہیں ہم اُن سے خفا ہیں،

مگر بات کرنے کو جی چاہتا ہے،

نظریں چار ہوئیں ، سارا گلہ جاتا رہا ، شام گلخپ میں کٹ گئی رات بھر پطرس ، سالک ، تبسم اور شاہ جی لاہور کی سڑکوں پر آوارہ پھرتے رہے ، شاہ جی اور سالک دونو خوش آواز تھے ، شاہ جی حافظ کی اس غزل کا مصرع اولیٰ اٹھاتے ، سالک مصرع ثانی ، اسی میں نصف رات کٹ گئی - - - - - - -

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی سے ناب و سفینۂ غزل است

شاہ جی خود راوی تھے کہ اس رات ہم نے اپنی شخصیتوں کو اپنے وجود سے خارج کر دیا تھا ، اکثر راہگیروں کو حیرت ہوتی کہ شرفا قسم کے لوگ موٹر میں اس طرح ٹاپتے پھر رہے ہیں ، غرض شاہ جی اور سالک صاحب اس مراجعت اور مفاہمت سے بے حد خوش تھے ، پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوگئے تو انقلاب عارضی طور پر بند ہوگیا ، شاہ جی لاہور سے اٹھ کر مظفرگڑھ چلے گئے ، میں نے "آزاد" جاری رکھنا چاہا لیکن پرایا پنچھی تھا پھر سے اُڑ گیا ، چٹان کا ڈیکلریشن لے چکا تھا اس کو جاری کرنے کا ارادہ کیا ، احرار کے دفتر سے چوٹ کھا کر ویرا ہوٹل میں آ گیا ، چٹان نکالا ، سالک صاحب بے حد خوش ہوئے خیر مقدم کا ایک دلآویز خط لکھا جو پہلے شمارہ میں شائع ہوا ، حالات معمول پر آ گئے تو انقلاب دوبارہ جاری کرنے کا قصد کیا ،

انقلاب کا اپنا دفتر فسادات کی وجہ سے تباہ ہو چکا تھا ، اُنہیں دفتر
کی تلاش تھی ، میں نے اپنے دفتر کا ایک بڑا حصہ انہیں دے دیا
اور وہ اس میں فروکش ہو گئے ، انقلاب دوبارہ جاری ہوا ، لیکن
زمانہ موافق حال نہ تھا ، سال چھ مہینے بعد بند ہو گیا ، سالک
صاحب اس زمانہ میں خاصے پریشان تھے ، تا ہم اُن کا فقر و استغنا
حیرت انگیز تھا ، اپنے چہرے مہرے سے کبھی پریشانی کا اظہار
نہ کیا ، یہی دن تھے جب ان سے تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے ،
مجید ملک ان دنوں مرکزی حکومت میں پرنسپل انفرمیشن آفیسر
تھے ، خواجہ ناظم الدین کی وزارت کا زمانہ تھا ، ان کی تقاریر
لکھنے کے لئے مجید ملک نے سالک صاحب کو کراچی بلا لیا .
اور وہاں اٹھارہ سو روپے ماہوار پر یہ خدمت سونپ دی ، سالک
صاحب وہاں تین چار سال رہے ، سارا عرصہ ان سے خط و کتابت
کا تانتا بندھا رہا ، میں خط لکھنے میں ذرا سست تھا ، وہ خط
لکھتے اور اتنے پیارے خط لکھتے کہ سطر سطر سے ان کی شخصیت
پھوٹی پڑتی ، اس سارے عرصہ میں انہوں نے کوئی دو سو خط
لکھیں ہوں گے ، پھر ۱۹۵۱ء سے یہ شعار بنا لیا تھا کہ ہر سال
کے پہلے شمارے میں چٹان کا افتتاحیہ لکھتے ، اس اداریہ میں اتنی
حوصلہ افروز اور نکتہ آفریں باتیں ہوتیں کہ ہم میں خود اعتمادی
پیدا ہوتی ، وہ بڑ کا درخت نہ تھے کہ اس کے سایہ میں کوئی پودا
ہی نہیں کھلتا وہ سورج اور ہوا کی طرح مہربان تھے ، دوسروں کا
دل بڑھانا بالخصوص نوجوان کو اچھالنا اور اُجالنا ان کی طبعیت کا

خاصہ تھا ، ہر شخص کے کام آنا ان کی فطرت ثانیہ تھی ، ہر ضرورتمند کی سفارش کرتے اور اس میں کوئی عیب نہ سمجھتے تھے ، ان کا خیال یہ تھا کہ سفارش تعلقات کی زکواۃ ہوتی ہے ، وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ سفارش کرنے سے سرکاری فرائض مجروح ہوتے ہیں ، ان کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ اس نظام اور اس معاشرہ میں سفارش کرنا انصاف اور حق کی دستگیری کرنا ہے ، جب تک ضرورتمند کا کام نہ ہوتا انہیں بے چینی رہتی ، کراچی سے مجھے ایک خط لکھا کہ فلاں شخص تمہارے پاس آ رہا ہے اُسے فلاں شخص سے کام ہے ، میں خود آ نہیں سکتا سفارش کا کام میں نے اپنے دو خلیفوں کے سپرد کر دیا ہے ، لاہور کے خلیفہ تم ہو اور کراچی کے مجید لاہوری ، اس شخص کے ساتھ جا کر پر زور سفارش کر دو ، رتی برابر تساہل نہ ہو ، یہ ہر طرح سفارش کے مستحق ہیں ، میں سال ششماہی کراچی جاتا تو میری خاطر دوستوں کو کھانے پر مدعو کرتے ایک دفعہ نگار ہوٹل میں پر تکلف عشائیہ دیا ، میں نے لاہور واپس آ کر خط لکھا کہ اس تکلف کی ضرورت کیا تھی ، بزرگوں سے خوردوں کی نسبت ہی بڑی شے ہے ، فوراً خط آیا کہ اس کی ضرورت تھی ، تمہارے متعلق یار لوگوں نے بہت کچھ کہہ سن رکھا تھا ، دفتر چٹان کی عمارت میں انقلاب کا دفتر کھلا تو بعض نے خوفزدہ کرنا چاہا کہ بے ڈھب آدمی کے ساتھ گذارہ مشکل سے ہو گا لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اور جو کچھ میں نے پایا اس سے میرے دل میں تمہارے لئے محبت اور عزت پیدا ہو گئی ہے ، وہ لوگ تمہیں

درشت کہتے تھے میں نے تمہیں ایک جان نثار دوست پایا ہے ، جو سلوک تم نے انقلاب کے ساتھ کیا اُس احسان سے میرا بال بال بندھا ہؤا ہے ،

خط پڑھتے ہی مجھے محسوس ہؤا کہ ان کے لفظوں میں ایک ایسا انسان بسا ہؤا ہے جس کی فطرت سلیم اور روح عظیم ہے ، معاملہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ میں نے ان سے کرایہ نہیں لیا تھا ، یا ایک دو مہینے بجلی کا بل اور فون کا کرایہ ادا کر دیا تھا ، لیکن سالک صاحب ہمیشہ کے لئے رطب اللسان ہو گئے ، مجھے اسی طرح عزیز رکھتے جس طرح اپنے دوسرے عزیزوں سے انہیں تعلق خاطر تھا ، دولتانہ وزارت نے چٹان بند کیا تو وہ سخت مضطرب ہوئے ، اپنے طور پر انہوں نے کوشش بھی کی کہ یہ بندش دور ہو جائے لیکن ان کی پیش نہ گئی ، خواجہ شہاب الدین ان دنوں وزیر داخلہ تھے ، ان سے کہا لیکن وہ بھی چٹان سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے ، قصہ کوتاہ بیل منڈھے نہ چڑھی ، چٹان سال بھر بند رہا دوبارہ نکلا تو افتتاحیہ لکھا ، اور اس ٹھاٹھ سے لکھا کہ ادب و انشا کا مزہ آ گیا ، اس اثنا میں جب کبھی لاہور آتے دفتر چٹان میں ضرور تشریف لاتے ، فرماتے ، گھر سے نکلتا ہوں تو صرف چٹان کے لئے یا راستہ میں مرزا محمد حسین سے مل لیتا ہوں ، غرض لاہور میں ہوتے تو دفتر چٹان میں التزاماً آتے شاذ ہی ناغہ کرتے ، یہ ان کا معمول تھا ، کئی کئی گھنٹے نشست ہوتی ، ابو صالح اصلاحی ہر موضوع پر بے تکان بولتے تھے ان سے دن بھر گپ شپ رہتی ، میں

ایک روز کسی رومانی دلچسپی میں غائب ہو گیا تو گلہ کیا اور میرے ابا جی سے کہہ گئے کہ میں صرف اس کے لئے آتا ہوں اور یہ محفل کی محفل ایک گرہ طلب مصرع پر قربان کر گیا ہے ، اگلے روز کراچی چلے گئے ، ایک پہلو دار خط لکھا کہ عشق رسوا ہو جائے تو عشق نہیں رہتا ، عیاشی ہو جاتا ہے ،۔

وہ بڑوں کی طرح چھوٹوں کو ان کی غلطیوں پر لتاڑتے یا جھاڑتے نہیں تھے ، نہ ان کے کان کھینچتے اور نہ ان پر وعظ و نصیحت کا بوجھ لادتے ، ھنسی مذاق میں اصلاح کرتے ، دوستوں کی طرح توجہ دلاتے ، اور بزرگوں کی طرح نقش جاتے تھے ، ان کی چال ڈھال یا بات چیت سے کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کوئی سرزنش کر رہے ہیں ، یا ان کے سامنے کوئی مطالبہ ہے ، ان کا ایک خاص انداز تھا جو انہی کے لئے مخصوص تھا ، وہ سب کے لئے یکساں لب و لہجہ رکھتے ، حفظ مراتب تو بہر حال ہوتا ھی ہے لیکن جہاں تک کسی سے مخاطب ہونے اس کی سننے ، اپنی سنانے اور باہمی مبادلہ افکار کا تعلق تھا وہ خورد و کلاں سب کی عزت نفس کا احترام کرتے تھے ، البتہ زبان کے معاملہ میں کسی سے خم نہ کھاتے خود اہل زبان ان سے خم کھاتے تھے ، ان میں آنا ضرور تھی اور ایگو کا یہ اظہار ہر فن کار یا قلمکار میں ہوتا ہے ، لیکن دوسروں کے جذبات مجروح کرنے کا تصور بھی ان کے ہاں نہیں تھا ، وہ اس طرح سوچ ھی نہ سکتے تھے انہوں نے ایک ھی فن سیکھا تھا ، کہ دوسروں کا حوصلہ کیونکر بڑھایا جاتا ہے ، پختہ مشق

ادباء و شعرأ سے لے کر نا پختہ کار ادباء و شعرأ اکثر و بیشتر ان کے پاس آتے وہ کسی کی حوصلہ شکنی نہ کرتے، ہر شخص کی استعداد کا خیال رکھتے اور شوق بڑھاتے تھے، ان کا فیض صحبت عام رہا پطرس مرحوم ان سے مستفید ہوتے رہے، تاثیر مرحوم نے بھی استفادہ کیا، امتیاز علی تاج نے بھی فیض اٹھایا، احمد ندیم قاسمی ان کے شاگرد ہیں، قاسمی ان پر نازاں سالک کو ان پر فخر، مجید لاہوری کو بھی انہی سے تلمذ تھا، دونو ایک دوسرے پر ناز کرتے تھے، "نیاز مندان لاہور" کا سارا حلقہ ان کا گرویدہ رہا تاہم یہ کوئی مجلس یا حلقہ نہ تھا، خود ایک مضمون میں جو انہوں نے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا تھا اس حلقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ آج کل نوجوان ہر چارپاری کو ایک تحریک بنا لیتے اور اس پر خیالات کے تانے بانے بنتے ہیں نیاز مندان لاہور کا اور چھور صرف یہ تھا کہ عبدالرحمن چغتائی نے لاہور سے ایک سالنامہ "کارواں" نکالا، جو اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے منفرد تھا، اس میں اہل زبان کی مدارات کے لئے نیازمندان لاہور کے نام سے دو ایک مضمون لکھے گئے جمنا پار کے بعض اہل قلم کا شیوہ تھا کہ وہ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کی زبان پر ناک بھوں چڑھاتے پطرس، سالک، تاثیر اور مجید ملک نے مل جل کر ان کا جواب دینا شروع کیا، سالک صاحب کی اپنی روائت کے مطابق نیاز مندان لاہور ان چاروں احباب کا مشترکہ نام تھا، جو کچھ لکھنا ہوتا باہم صلاح مشورہ کر لیتے، پطرس مضمون لکھتے آپس میں غور

کیا جاتا ، اس کے بعد مضمون چھپ جاتا ، غرض ان مضمونوں کی خاصی شہرت ہو گئی ، یہ گویا پہلا تابڑ توڑ حملہ تھا جو راوی و چناب کے اہل قلم نے گنگا و جمنا کے اہل قلم پر کیا ، ان مضامین میں معذرت کا انداز تھا ھی نہیں ، اس سے پہلے اہل زبان پنجاب کے اہل قلم پر حملہ کرتے تو یہاں کے لوگ مسخر و مرعوب ہو جاتے یا پھر ایک ھی چارہ تھا کہ مدافعت میں سند و جواز لائیں ، یا اہل زبان جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے سامنے سر جھکا دیں ،

نیاز مندان لاہور کے ان مقالوں کا رد عمل یہ ہوا کہ روبرو بات کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی ، اہل زبان کو بھی کان ہو گئے ، برتری کا غرور جاتا رہا ، محض اہل زبان ہونا فضیلت کا باعث نہ رہا ، نتیجتہً توتکار بھی زیادہ عرصہ نہ رہی اور نہ اس طرف کے سنجیدہ اہل قلم نے اس میں حصہ لیا ، سالک صاحب نے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ اس کو تحریک کہنا یا کسی باقاعدہ حلقے سے منسوب کرنا صحیح نہیں اور نہ کبھی اس انداز میں سوچا ہی گیا ، اب جو لوگ نیاز مندان لاہور میں شریک ہوتے ہیں وہ پطرس ، سالک ، تاثیر اور مجید ملک کے دوست ضرور تھے لیکن نیاز مندان لاہور کے شریک قلم نہ تھے ، مثلاً صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ، حفیظ جالندہری اور امتیاز علی تاج ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے ، تاثیر مرحوم ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں استاد تھے ، انہوں نے اپنے گرد خوش ذوق شاگردوں کا ایک حلقہ جمع کیا ہوا تھا ، جس میں محمود نظامی ، اور حمید نسیم کو خصوصیت حاصل تھی ، اس سارے گروہ نے

عہد کر رکھا تھا کہ ادب و شعر میں جو کچھ ہے انہی کے دم قدم سے ہے۔ پنجاب میں ان سے باہر کچھ نہیں سالک صاحب ان کے پیر و مرشد تھے ، اس حلقہ نے یا (نیاز مندان لاہور ہی کہہ لیجئے) یکے بعد دیگرے چار محاذوں پر جنگ چھیڑی ، راوی پار سے جمنا پار پر حملۂ ترکانہ ان کا دوسرا مورچہ تھا ، اس سے پہلے یہ لوگ علامہ سیماب اکبر آبادی کو لاہور سے بھگا چکے تھے ، سیماب مرحوم اپنے چہیتے ساغر نظامی کے ساتھ لاہور میں وارد ہوئے اور یہاں ٹکنا چاہا ، مشاعروں میں جھڑپیں ہوئیں ، جس سے باقاعدہ محاذ کھل گیا ، سیماب نے ہر چند مقابلہ کرنا چاہا اور کچھ دنوں خم ٹھونک کو ڈٹے رہے لیکن بالاخر پسپا ہو کر بھاگ گئے سیماب سے تکرار کی ایک وجہ ساغر نظامی بھی تھے ، ان دنوں ساغر خود ایک غزل تھے ، سیماب ان کے بغیر جی ہی نہیں سکتے تھے ، اپنے کلام کا بڑا حصہ ان کے حوالے کر دیا ، ساغر بلا کے خوش آواز تھے ، سرخ و سپید رنگ ، بوٹا سا قد ، سر تا قدم ادا ہی ادا ، مشاعرہ پڑھتے تو سامعین کو بہا کے لے جاتے ، نیاز مندان لاہور کے واحد شاعر حفیظ جالندھری تھے ، وہ شکل و صورت کے اعتبار سے تو واجبی تھے لیکن گلا انہوں نے بھی نورانی پایا تھا ، نہ ایک نیام میں دو تلواریں سما سکتی ہیں نہ ایک مشاعرے میں دو گلے ، سیماب کو زعم تھا کہ وہ میر تقی میر اور اسد اللہ خاں غالب کے ھم رتبہ ہیں ، زبان ان کی لونڈی ہے ، نیاز مندان لاہور اپنی قلمرو میں کسی دوسرے کی فرمانروائی کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے ، وہ زبان کو اپنی گھوڑی

سمجھتے تھے ۔ نتیجۃً آپس میں ٹھن گئی ، شیخ عبدالقادر کی صدارت میں طرحی مشاعرہ تھا ، قافیہ تھا سیلاب ، ردیف تھی رہ گیا ، ساغر نے دون کی لی ، مقطع پڑھا - - - - -

ساغر کے زمزموں کی تب و تاب الاماں
ہر معرکہ میں شاعر پنجاب رہ گیا ،

چوٹ حفیظ پر تھی ، سالک پھریری لے کر اُٹھے ،

میاں صاحبزادے ! وہ دوسرا مقطع بھول گئے ہو - - -

پیر مغان کی بادہ گساروں سے ٹھن گئی
ساغر کی تہ میں قطرۂ سیماب رہ گیا ،

مشاعرہ لوٹ پوٹ ہو گیا ، سیماب کٹ کے رہ گئے ، ساغر کا رنگ اُڑ گیا ، اسی طرح کے ایک اور مشاعرہ میں مڈ بھیڑ ہو گئی ، ساغر نے رباعی پڑھی ، چوتھا مصرع تھا ع

یوسف کی قمیص ہے جوانی میری

سالک صاحب نے آواز دی - - - - میاں ! وہ بھی پیچھے ھی سے پھٹی تھی ، مشاعرہ زعفران زار ہو گیا ، ساغر نے کسی مصرع میں کوئی محاورہ غلط باندھ دیا ، سالک صاحب نے سر عام ٹوکا ، ساغر نے اپنے طور پر کاٹنا چاہا ،

کاش آپ کی زبان مجھ میں ہوتی ،

سالک صاحب نے چمک کر فرمایا ،

میاں صاحبزادے ! میں اپنی زبان کی بات نہیں کر رہا تمہاری مادری زبان کا ذکر کر رہا ہوں ،

نتیجہ یہ ہوا کہ سیماب صاحب زیادہ دن لاہور میں نہ رہ سکے ، ساغر کو لے کر لوٹ گئے ، میدان حفیظ کے ہئے رہ گیا ، جو عموماً جمنا پار کے مشاعروں سے دل آزردہ ہو کر آتے تھے ، سالک صاحب زبان سے بغاوت کے حامی نہ تھے ، وہ اپنے ساتھیوں کو ان کی خفی و جلی غلطیوں پر ٹوکتے اور ان کی اصلاح کرتے ، لیکن وہ اہل زبان کی صرف زبان کے غرور پر برتری کے بھی قائل نہ تھے ، پاکستان بنا تو دہلی و لکھنو کے بعض اہل قلم لاہور آ گئے ، ان میں نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی بھی تھے ، باتوں باتوں میں خواجہ صاحب نے سالک صاحب سے کہا ، چلئے ہم لوگوں کے آنے سے ایک فائدہ تو ہو گا کہ پنجاب والوں کی زبان صاف ہو جائے گی ، سالک صاحب نے جھٹ سے فرمایا جی ہاں ، انشا اللہ مادری زبان ہو جائے گی ، خواجہ صاحب تاڑ گئے لیکن مسکرا کے رہ گئے ،

ان کا تیسرا محاذ علامہ تاجور نجیب آبادی کے خلاف تھا ، سالک صاحب بظاہر کیا طبعیتاً لڑاکا نہ تھے اب چونکہ نیاز مندان لاہور ان کے بھی نیاز مند تھے ، لہذا وہ ان کے لئے تلوار بھی تھے ، اور سپر بھی ، اصل لڑائی حفیظ و تاثیر کی تھی ، حفیظ کو شاعرانہ حسد و رقابت سے مفر نہ تھا ، تاثیر کو فطرتاً چوچلوں میں مزہ آتا تھا ، تاجور سے کٹا چھنی کا سبب بھی یہی تھا ان سب نے ان پر یلغار کی ، وہ بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے ، انہوں نے بھی

سمجھتے تھے - نتیجتاً آپس میں ٹھن گئی ، شیخ عبدالقادر کی صدارت میں طرحی مشاعرہ تھا ، قافیہ تھا سیلاب ، ردیف تھی رہ گیا ، ساغر نے دون کی لی ، مقطع پڑھا - - - - -

ساغر کے زمزموں کی تب و تاب الاماں
ہر معرکہ میں شاعر پنجاب رہ گیا ،

چوٹ حفیظ پر تھی ، سالک پھریری لے کر اُٹھے ،

میاں صاحبزادے ! وہ دوسرا مقطع بھول گئے ہو - - -

پیر مغاں کی بادہ گساروں سے ٹھن گئی
ساغر کی تہ میں قطرۂ سیماب رہ گیا ،

مشاعرہ لوٹ پوٹ ہو گیا ، سیماب کٹ کے رہ گئے ، ساغر کا رنگ اُڑ گیا ، اسی طرح کے ایک اور مشاعرہ میں مڈ بھیڑ ہو گئی ، ساغر نے رباعی پڑھی ، چوتھا مصرع تھا ع

یوسف کی قمیص ہے جوانی میری

سالک صاحب نے آواز دی - - - میاں ! وہ بھی پیچھے ھی سے پھٹی تھی ، مشاعرہ زعفران زار ہو گیا ، ساغر نے کسی مصرع میں کوئی محاورہ غلط باندھ دیا ، سالک صاحب نے سر عام ٹوکا ، ساغر نے اپنے طور پر کاٹنا چاہا ،

کاش آپ کی زبان مجھ میں ہوتی ،

سالک صاحب نے چمک کر فرمایا ،

میاں صاحبزادے! میں اپنی زبان کی بات نہیں کر رہا تمھاری مادری زبان کا ذکر کر رہا ہوں،

نتیجہ یہ ہوا کہ سیماب صاحب زیادہ دن لاہور میں نہ رہ سکے، ساغر کو لے کر لوٹ گئے، میدان حفیظ کے ہئے رہ گیا، جو عموماً جمنا پار کے مشاعروں سے دل آزردہ ہو کر آتے تھے، سالک صاحب زبان سے بغاوت کے حامی نہ تھے، وہ اپنے ساتھیوں کو ان کی خفی و جلی غلطیوں پر ٹوکتے اور ان کی اصلاح کرتے، لیکن وہ اہل زبان کی صرف زبان کے غرور پر برتری کے بھی قائل نہ تھے، پاکستان بنا تو دہلی و لکھنو کے بعض اہل قلم لاہور آ گئے، ان میں نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی بھی تھے، باتوں باتوں میں خواجہ صاحب نے سالک صاحب سے کہا، چلئے ہم لوگوں کے آنے سے ایک فائدہ تو ہو گا کہ پنجاب والوں کی زبان صاف ہو جائے گی، سالک صاحب نے جھٹ سے فرمایا جی ہاں، انشا اللہ مادری زبان ہو جائے گی، خواجہ صاحب تاڑ گئے لیکن مسکرا کے رہ گئے،

ان کا تیسرا محاذ علامہ تاجور نجیب آبادی کے خلاف تھا، سالک صاحب بظاہر کیا طبعیتاً لڑاکا نہ تھے اب چونکہ نیاز مندان لاہور ان کے بھی نیاز مند تھے، لہذا وہ ان کے لئے تلوار بھی تھے، اور سپر بھی، اصل لڑائی حفیظ و تاثیر کی تھی، حفیظ کو شاعرانہ حسد و رقابت سے مفر نہ تھا، تاثیر کو فطرتاً چوچلوں میں مزہ آتا تھا، تاجور سے کٹا چھنی کا سبب بھی یہی تھا ان سب نے ان پر یلغار کی، وہ بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے، انہوں نے بھی

خم ٹھونک کر مقابلہ کیا ، کوئی اور ہوتا تو لازماً بھاگ جاتا لیکن تاجور آخر وقت تک ڈٹے رہے جھکے نہیں ، آخری عمر میں انہیں سید عابد علی عابد کے ہاتھوں سخت آزار پہنچا ، لیکن وہ ہر چوٹ کھانے کے عادی ہو گئے تھے ، عابد صاحب اب تو نیاز مندان لاہور میں شمار ہونا چاہتے ہیں لیکن اس وقت تاجور کے عقیدتمندوں میں تھے ان کی شاعری کو پروان چڑھانے میں بھی تاجور کا ہاتھ تھا ، انہی کے رسالوں نے انہیں جلا بخشی ،

تاجور نے لاہور سے جس پائے کے ادبی رسالے نکالے وہ آج تک صحافت میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں ، ''ادبی دنیا'' کی نیو رکھی ، جب تک اس کے ایڈیٹر رہے اس کا ڈنکا بجتا رہا ، پھر شاہکار نکالا ، اور شاہکار بنا دیا ، بچوں کے لئے ہفتہ وار پریم نکالا ، اردو مرکز قائم کیا ، اس کے اہتمام میں بہت سے مجموعے مرتب کر کے شائع کئے ، بیسیوں نوجوانوں کی ادبی تربیت کی مشاعروں کو عام کیا ، غرض جہاں تک زبان اردو کے مذاق کو عام کرنے کا تعلق ہے۔ ایک ادارہ سے بڑھ کر کام کیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جو کام پطرس ، تاثیر ، تبسم ، حفیظ اور تاج سے نہ ہو سکا وہ تاجور نے تنہا کیا ، ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا ، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے گرد و پیش نیاز مندان لاہور جیسا کوئی حلقہ نہ تھا ، کہ وہ لوگ سیاسی فطرت کے ادبی کھلاڑی تھے ، سالک نے تو عمر بھر قلم ہی کی خدمت کی ، اور اتنا لکھا کہ انتخاب ہی کے کئی مجموعے شائع ہو سکتے ہیں ، لیکن پطرس ادب میں کب

تک زندہ رہ سکتے ہیں ؟ یہ محل نظر ہے ، مرحوم ایک ادیب سے زیادہ ایک محفل آرا شخصیت تھے ، جنھیں مختلف زبانوں کے ادبیات کا انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا تھا ، لیکن ان کی یہ خوبی ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئی ، تاثیر کا ادبی ترکہ محدود ہے ، اور اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت بھی برائے نام ہے ، لیکن وہ زبردست ادبی اور سیاسی کھلاڑی تھے ، انھیں اس برعظیم میں ترقی پسند تحریک کا سرخیل کہا جا سکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اپنے ہی داؤں پیچ کی وجہ سے وہ اسی پود کے ہاتھوں مارے گئے جسے انھوں نے خود تیار کیا یا جس کا بیج ان کے اپنے ہاتھوں بویا گیا تھا ، پاکستان میں ترقی پسند تحریک کو ان کے ہاتھوں شدید نقصان پہنچا ، لیکن ترقی پسندوں کے ہاتھ سے انھیں بھی بہت سے گھاؤ لگے ، مجید ملک سرکاری افسر ہو کر سرکاری افسر ہی رہ گئے ، انھوں نے اس جوڑ توڑ میں کبھی حصہ نہ لیا - جو تاثیر مرحوم کا شیوہ خاص رہا - تبسم عمر بھر طلبہ کے اُستاد رہے - پھر ریڈیو کے ہو گئے - ان کے کلام میں پختگی ضرور ہے شگفتگی ٹاواں ٹاواں ہے - امتیاز علی تاج مرنجان مرنج ہیں - لیکن انارکلی یا چچا چھکن میں اتنا بوتا نہیں کہ انھیں دوام حاصل ہو - ان کی حیثیت ایک مہر شدہ ادیب کی ہے - البتہ حفیظ میں ایک بڑے شاعر کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں - ان کے بغیر اردو غزل یا اردو نظم کا ہر تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے -

غرض نیاز مندان لاہور جس حلقہ کا نام رہا وہ پہلی سازش تھی جو ادب میں کی گئی ، ان لوگوں نے انجمن ستائش باہمی کی بنیاد

رکھی ، صوبہ بھر میں اپنے حلقہ سے باہر نہ تو کسی اہل قلم کی ادبی وجاہت کو یہ لوگ تسلیم کرتے اور نہ اپنے سوا کسی کو بالا سمجھتے تھے ، علامہ اقبال کے گرد انہوں نے عقیدت کا حصار بنا رکھا تھا ، اور اس کے وجوہ تھے سالک صاحب کے مرشد بننے یا بنانے کے بھی محرکات تھے ، مثلاً زمیندار سے انقلاب کی کٹا چھنی ، عام آویزشوں میں ایک روزنامہ کی ضرورت ، سالک کا قلم جس سے ادبی اور سیاسی محاذوں میں رسد پہنچتی تھی ،

ماھناموں میں نیرنگ خیال کے عروج کا زمانہ تھا ، اور وہ ان کے ھاتھ میں تھا ، اس کے مقابلے میں عالمگیر تھا ، لیکن وہ ان جھگڑوں سے ہمیشہ الگ رہا اس پر یو پی اور حیدر آباد کے اہل قلم چھائے ہوئے تھے ، تاجور پہلے ادبی دنیا پھر شاھکار کے مالک و مدیر رہے ، حفیظ نے ان کے خلاف قلم اٹھایا ، مشاعروں میں تکا فضیحتی ہوئی تو علامہ نے بھی طبیعت کی جولانی دکھائی ، بڑے زور کا رن پڑا ، علامہ صاحب نے ادبی دنیا کے سالنامہ میں حفیظ کا نام لئے بغیر لیکن انہیں مخاطب کر کے اس زور کی نظم لکھی کہ زبان و فن کا لطف آ گیا ، اس نظم میں کھلی ھجو تو نہ تھی لیکن سخت قسم کے نشتر ضرور تھے ، سالک صاحب نے اس ساری لڑائی میں نیاز مندان لاہور کی مدافعت کی ، اور خوب کی ، تاجور البتہ سالک سے لڑنا نہیں چاھتے تھے ، ان سے ھلکی پھلکی چوٹیں ہوتی رہیں ، نتیجتاً یہ محاذ کبھی سخت گرم ہوتا کبھی سخت سرد ،

ادھر تاجور نے بھی نوجوان لکھنے والوں کی ایک کھیپ پیدا

کی ، اور وہ نیاز مندان لاہور کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب رہے ، اختر شیرانی کو ان سے تلمذ تھا ۔ وقار انبالوی ان کے صحبت یافتہ تھے ، عبدالحمید عدم نے ان سے فیض اٹھایا ، احسان دانش زبان و فن کے رموز میں ان سے متمتع ہوئے ، فاخر ہریانوی ، فیاض ہریانوی ، اودے سنگھ شائق ، کرپال سنگھ بیدار ان کے باقاعدہ شاگرد تھے ، اس باب میں ان کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے ،

ان ادبی معرکوں کی تفصیلات اس وقت سامنے نہیں اور نہ زیر قلم خاکے میں یہ ساری تفصیل آ سکتی ہے البتہ انہیں جمع کیا جائے تو ایک دلچسپ ادبی تاریخ تیار ہو سکتی ہے ،

"موت سے کس کو رستگاری ہے" تاثیر دیکھتی آنکھوں رخصت ہو گئے ، پطرس کو امریکہ میں سناونی آ گئی ، سالک کو بھی بلاوا آ گیا ، اور وہ اپنے رب سے جا ملے ، ان سے پہلے تاجور صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے ، آخری عمر میں ان کی خواهش تھی کہ سالک سے ان کی صلح ہو جائے ، خود مجھ سے کئی دفعہ کہا ، چونکہ روہیلا پٹھان تھے اس لئے طبیعت میں ضد بھی تھی ، بہر حال ایک دن صلح ہو گئی ، دونو استاد بھائی تھے جب گلے سے آ ملے سارا گلہ جاتا رہا ،

ادھر کئی برس پہلے نیاز مندان لاہور کی ہا ھمی کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا ، حفیظ ان سب سے الگ رہنے لگے ، بلکہ ان کے خلاف تند و ترش باتیں کرتے ، تاثیر اور حفیظ میں مدۃ العمر

کھچاؤ رہا ، حفیظ نے سوز و ساز میں سالک صاحب کے خلاف چٹکی لی ، سالک صاحب کا بیان تھا کہ گراسی علیہ الرحمۃ نے مرنے سے پہلے حفیظ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا تھا کہ اس کی شاعری پر نگاہ رکھنا ، یہ روایت حفیظ کو ناگوار گذری ، ہوا یہ کہ طرفین کے دلوں میں غبار آ گیا ، لیکن موت نے یہ قضیہ بھی چکا دیا ، سالک رہے نہ تاجور ، پطرس رہے نہ تاثیر ، رہے نام اللہ کا ، حفیظ بقید حیات ہیں ، لیکن ان دوستوں اور ان دنوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں ،

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کے ظہور اور عروج کا زمانہ تھا ، نیاز مندان لاہور ان پر بھی حملہ آور ہو گئے ، اسلامیہ کالج میں فروغ اردو کے نام سے طلبہ کی جو انجمن قائم تھی تاثیر اس کے سرپرست تھے ، اس میں خاص خاص مصلحتوں سے خاص خاص مضمون لکھوائے پڑھوائے اور چھپوائے جاتے تھے ، جوش بھی ان کا حدف بنا انہی دنوں احسان دانش نے چمکنا شروع کیا ، لاہور سے ان کا اٹھنا حفیظ کے لئے قیامت ہو گیا ، حفیظ اپنے رنگ کے شاعر تھے ، ان کا ترنم ان کے ساتھ مخصوص ہو چکا تھا ، احسان دانش کی شاعری جوش سے شانہ ملا کر نکلی ، آواز اس بلا کی تھی کہ جس مشاعرے میں جاتے انہی کا ہو جاتا ، نیاز مندان لاہور کے لئے یہ نئی افتاد تھی ، احسان سہی کمزوری یہ تھی کہ وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل نہ تھے ، قدرت کے عطیہ نے انہیں بالا بلند شاعروں کی صف میں لا کھڑا

کیا ، ان دنوں تاثیر کا یہ شہرہ تھا کہ فن و ادب میں یگانہ ہیں ، احسان نے غزلوں کا مجموعہ "حدیث ادب" مرتب کیا تو اصلاح کی غرض سے تاثیر کے پاس لے گئے ، تاثیر نے مجموعہ ضائع کر دیا لیکن احسان سے کہا کہ گم ہو گیا ہے ، احسان نے دوبارہ محنت کر کے مجموعہ مرتب کیا ، تاثیر نے اب یہ کیا کہ اسے گم تو نہ کیا لیکن اس کے معیاری اشعار مجروح کر دیئے ، عجب نہ تھا کہ احسان اور نقصان اٹھاتے لیکن ان پر اصل حقیقت آشکار ہو گئی ، کہ حفیظ انہیں گوارا نہیں کرتے ، حفیظ کی مملکت میں کسی دوسرے شاعر کا شاعری یا ترنم کی وجہ سے مقبول ہونا ان کے لوگوں کے نزدیک جرم تھا

تاجور نے احسان کا ساتھ دینا شروع کیا ، احسان روز بروز چمکتے گئے ، حتیٰ کہ ہر مشاعرہ کے لئے نا گزیر ہو گئے ، ان کی آواز کا جادو صوبائی عصبیتوں کو ختم کر گیا ، نیاز مندان لاہور کی ہیبت ماند پڑ گئی ، شاعری کی نئی نئی راہیں کھلیں ، کئی مدرسہ ہائے فکر پیدا ہو گئے ، ادب و انشاء میں اس تیزی کے ساتھ سیلاب آیا کہ نیاز مندان لاہور کا اجارہ خود بخود بیٹھ گیا ، "نیاز مندان لاہور" کا چوتھا محاذ مولانا ظفر علی خاں کے خلاف تھا ، یہ محاذ زمیندار اور انقلاب کے تصادم سے کھلا ، سالک صاحب اس کے سالار تھے ، ایک طرف مولانا ظفر علی خاں تن تنہا ، دوسری طرف مہر ، سالک ، دونوں ہی قلم کے دھنی ، ان کے لاؤ لشکر میں حفیظ ، تاثیر ، تبسم ، پطرس ،

تاثیر قدوسی نظامی کے فرضی نام سے ظفر علی خاں کے مقابلہ میں نکلے ، لیکن کہاں راجہ بھوج کہاں ننوا تیلی ، ظفر علی خاں چومکھی لڑنے میں بے مثال تھے ، انہوں نے ایک ایک سے دو دو ہاتھ کئے ، جو سامنے آیا ڈھیر ہو گیا ، ہجو نگاری میں ان سے کون نپٹ سکتا تھا ، بہ قول سید سلیمان ندوی وہ اردو کے تین کامل الفن اساتذہ میں سے ایک تھے ، اول محمد رفیع سودا دوم اکبر الہ آبادی سوم ظفر علی خاں ، سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں میں طرحیں نکالتے اور ادق سے ادق قافیوں میں رونق پیدا کرتے تھے ، مولانا با خبر رہتے کہ فلاں نظم کس کی ہے ؟ اور فلاں دشنام کہاں سے آئی ہے ؟ تاثیر کو اس بری طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ چھٹکارا مشکل ہو گیا ، مولانا نے انقلاب کے میمنہ و میسرہ میں ان لوگوں کو دیکھا تو للکارتے ہوئے اعلان کیا ، - - - - -

زمیندار ایک آپ اتنے مگر اوج صحافت پر !!

یہ اک تکل لڑے گا آپ کی ساری پتنگوں سے ،

چنانچہ اس تکل کے ہاتوں ساری پتنگیں کٹ گئیں ، کوئی دو ماہ گھمسان کا یدھ رہا ، ادھر بیسیوں سورما ، ادھر ایک ہی پرانا پھکیت ، ہر ضرب کاری ، آخر علامہ اقبال کی مداخلت سے میثاق ہو گیا ،

سالک صاحب زبان کی باریکیوں سے کما حقۂ آگاہ تھے ، روز مرہ اور محاورہ میں کبھی ٹھوکر نہ کھاتے قواعد زبان سے بخوبی

واقف تھے ، املا کا غایت درجہ خیال رکھتے ، اردو اخبار نویسی
میں اعلیٰ معیار قائم کیا ، وہ صحافتی قبیلے کی آخری کھیپ کے شہسوار
تھے ، ان کی ذات میں بیک وقت ادب و شعر کی بہت سی روائیتیں
جمع ہو گئی تھیں ، وہ شاعر بھی تھے ، ''راہ و رسم منزلہا ،، کے
نام سے ان کا ایک مجموعہ کلام بھی چھپا ، انقلاب نکلا تو شاعری
گاہے ماہے کی چیز ہو گئی ، انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا
ان کے بائیں ھاتھ کا کھیل تھا ، اتنا شستہ اور رفتہ ترجمہ کرتے
کہ بسا اوقات اصل ماند ہو جاتا ، کئی ترجمے طبعزاد معلوم
ہوتے ، ٹیگور کی گیتا نجلی کا ترجمہ بڑا مقبول ہوا ، گاندھی جی نے
بھی اس کو سراھا ، نثر لکھنا ان کے لئے اتنا ہی آسان تھا جتنا
آبشار کے لئے بہنا ، بے تکان اور بے تکلف لکھتے ، کسی اسلوب کے
مقلد نہ تھے فرماتے مطالعہ انسان کے ذخیرہ معلومات میں اضافہ
کا باعث ہوتا اور اس سے اسلوب بنتا ہے جس آدمی کی معلومات
جتنی وسیع ہوں گی اس کا اسلوب تحریر اتنا ہی صاف ستھرا ہو گا ،
وہ محض انشا پردازی یا محض لفاظی کے حق میں نہ تھے ، ان کی تحریریں
اس لحاظ سے بڑی دلفریب ہوتیں کہ سیدھے سادے الفاظ میں بڑی بڑی
باتیں کہہ جاتے تھے ، وہ کسی مسئلہ میں صرف الفاظ پر گذارہ نہ
کرتے اور نہ ان کا سہاوا لیتے تھے ، انقلاب کے شذرات اور سہر صاحب
کی غیر حاضری میں اداریئے بھی وہی لکھا کرتے ، کم لوگ جانتے
تھے ، کہ جو شخص مطائبات نویسی میں یکہ تاز ہے وہ اس قسم کی
ثقہ عبارت بھی لکھ سکتا ہے ، انہیں نثر کے ہر اسلوب پر قابو تھا ،

وہ شگفتہ ضرور تھے لیکن مزاح کے علاوہ بھی ان کا قلم کسی موضوع پر بند نہیں تھا، انہوں نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں تاریخ، تذکرہ، سیرت اور ادب کے موضوع بھی ہیں، ان سے یہ ظاہر ہی نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف کوئی ادیب طناز، بذلہ سنج صحافی یا مطائیبات نویس ایڈیٹر ہے ان کی شہرت افکار و حوادث کی وجہ سے ہوئی، بلکہ یار لوگوں میں ان کا نام ہی پیر افکار شاہ پڑ گیا، افکار و حوادث نے روزناموں میں مطائیبات کو آب و دانہ بخشا، اس کی دیکھا دیکھی کئی ایک مطائیبات نویس پیدا ہو گئے، لیکن افکار و حوادث سر فہرست ہی رہا، سند باد جہازی (چراغ حسن حسرت) سے قطع نظر شائد ہی کوئی مطائیبات نویس ہو جس کی زبان میں سالک صاحب جیسی شوخی، ندرت، برجستگی، شگفتہ پن، طنز، گھاؤ- بے ساختگی اور سادگی پائی جاتی ہو، انہوں نے سب سے بڑا جہاد جعلی پیروں اور مصنوعی صوفیوں کے خلاف کیا، غلط گو شعرأ اور پوچ نویس ادبأ کو آڑے ھاتھوں لیا، جس سے اصلاح زبان ہوتی گئی، اس کے علاوہ افکار و حوادث میں کانگریس اور اس کے زعما پر پھبتیاں کسی جاتیں یا اُن لوگوں پر چوٹیں ہوتیں جو کانگریس سے قریب اور سرکار کے حریف تھے، انقلاب کے اس کردار کا دفاع نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مزاج حکومت کے نزدیک رہا، لیکن زبان کا ذائقہ جو ان کے ھاں تھا اور کہیں بھی نہ تھا، زبان ہی کا لطف تھا کہ ان کی پھبتیاں بھی پھول معلوم ہوتی تھیں، بسا اوقات ان کی پھبتی ننگی بھی ہو جاتی، مگر وہ جس رخ سے پھبتی

کستے ، طعن توڑتے ، مصرع اُٹھاتے ، بذلہ فرماتے ، لطیفہ گھڑتے اس میں ایک خاص سرور تھا ، کہ خود چوٹ کھانے والوں کی زبان پر کلمہ تحسین ہوتا ، وہ اس فن میں بڑے ہی مشاق تھے ، کوئی سی پھبتی ان کی زبان پر آ کر رہ نہیں سکتی تھی ، اصل خوبی ان کی یہ تھی کہ وہ الفاظ سے مزاح پیدا نہیں کرتے تھے بلکہ ظرافت ان کے دماغ سے اُگتی تھی ، سیدھے سادے الفاظ میں چوٹ کر جاتے ، انہیں مزاح و ہزل کی حدوں کا بھی اندازہ تھا - اور بذلہ و طنز کی رگیں بھی پہچانتے تھے ، وہ فحاشی ، پھکڑ ، گالی گفتار ، ضلع جگت ، پھبتی ، طنز ، ھجو ، تضحیک اور طعن کے فرق کو بخوبی سمجھتے تھے ، کبھی کبھار ان کے الفاظ غصیل بھی ہو جاتے اور ان سے شدید قسم کا گلہ بھی پیدا ہوتا ، لیکن شاذونادر ، اس قسم کا گلہ عموماً ذو معنی الفاظ کے استعمال سے پیدا ہوتا ، وہ قلم اور زبان دونو کے حاتم تھے ، جس محفل میں بیٹھتے ، پھبتیوں کی جھاڑ باندھتے ، اور لطیفوں کا انبار لگاتے ، قلم اٹھاتے تو ان کا یہی حال ہوتا ، نام بگاڑنے میں عجیب و غریب خصوصیت کے مالک تھے ، مثلاً انگلستان کے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کا نام اس کی ھندو نوازی کے باعث رام جی مکندا مل رکھا ، عطاء اللہ شاہ بخاری کا بخار اللہ شاہ عطائی ، مظہر علی اظہر کا ادھر علی آدھر ، ان کے علاوہ کچھ اور راھنماؤں کے نام بھی مسخ کئے ، لیکن ان میں مطائبات کی شیرینی نہ تھی ، دشنام کی سنگینی تھی ، ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن صدر مجلس احرار اسلام نے تقریر میں کہا بعض تھڑدلے ھمیں بدنام کرنے

کے لئے چندے کا حساب مانگتے ہیں، ہم لوگ بنیا نہیں کہ حساب لئے پھریں، ہمیں اپنی دیانت پر اعتماد ہے، جو لوگ ہم پر بھروسہ کرتے ہیں وہ چندہ دیں باقی ہوا کھائیں، سالک صاحب نے افکار و حوادث میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا حضرت مولانا کس کم بخت نے آپ سے کہہ دیا کہ آپ بد دیانت ہیں؟ دیانت تو آپ کے گھر کی لونڈی ہے، شکایت یہ ہے کہ آپ نے بے نکاحی رکھی ہوئی ہے،

ایک محفل میں اختر علی خاں (اللہ انہیں بخشے) کے لا ابالی پن کا ذکر ہو رہا تھا، کہ وہ شہید گنج میں کوئی دستاویز اٹھا کر ماسٹر تارا سنگھ کو دے آئے تھے، سالک صاحب نے تبسم فرمایا، اور کہا، چھوڑ یار، اختر علی خاں بھی تو تارا سنگھ ہی کا ترجمہ ہے -----

کلیم صاحب ملٹری اکاؤنٹس میں غالباً ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل یا اس سے بھی کسی بڑے عہدے پر فائز تھے، انہیں شعر و سخن سے ایک گونہ لگاؤ تھا، اکثر مشاعرے رچاتے ایک مشاعرہ میں سالک صاحب بھی شریک تھے، کسی نے ان سے کلیم صاحب کے بیٹے کا تعارف کراتے ہوئے کہا،

آپ کلیم صاحب کے صاحبزادے ہیں ؟

رگ ظرافت پھڑک اٹھی فرمایا -----

تو یہ کہئے آپ ضرب کلیم ہیں،

غرض ان کا سینہ اسی قسم کے لطائف الادب کا خزینہ تھا ، جس محفل میں ہوتے چھا جاتے ، برجستہ گوئی ، حاضر جوابی ، بذلہ سنجی ، شگفتہ مزاجی ، شعر فہمی ، نکتہ آفرینی ، یہ سب گویا ان کے خانہ زاد تھے ، طبیعت میں آمد ہی رہتی ، آورد کا ان کے ہاں گذر ہی نہیں تھا ،

ایک تہائی صدی انہوں نے بڑے آدمیوں کی رفاقت اور صحبت میں بسر کی ، اس زمانہ کا شائد ہی کوئی بڑا ہندوستانی یا پاکستانی ہو جن سے ان کے تعلقات نہ رہے ہوں ، بڑے بڑوں سے ان کا ملاپ رہا ، چنانچہ میری ہی تحریک پر انہوں نے ''یاران کہن'' لکھی ، جو مکتبہ چٹان سے شائع ہوئی ، اس میں کوئی بیس نامور لوگوں کا ذکر کیا ہے ، جن میں اکثر ملک و ملت کے جلیل القدر راھنما تھے ، ان بزرگوں اور دوستوں کا شائد ہی کوئی لطیفہ ہو جو انہیں یاد ہو اور رہ گیا ہو ، ''سرگذشت'' کے نام سے انہوں نے اپنے سوانح حیات قلمبند کئے ، پہلے '' امروز '' پھر '' نوائے وقت '' میں قسط وار چھپتے رہے ، آخر کتابی شکل میں شائع ہو گئے ، اس کتاب سے ان کے ذہنی نشو و نما اور ادبی و سیاسی مذاق ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ بہت سی برگزیدہ ہستیوں اور نامور شخصیتوں کی سیرت کا عکس بھی مل جاتا ہے ، حسرت کے الفاظ میں ''سرگزشت'' ہمارے ملک کی چہل سالہ علمی ادبی اور سیاسی سر گرمیوں کا مرقع ہے ، ظرافت ان کے قلم سے یوں نکلتی ہے جیسے کڑی کمان سے تیر ، عام طور پر وہ لکھتے لکھاتے کوئی ایسا لطیفہ یا چٹکلہ بیان کر جاتے

ہیں کہ خشک سے خشک بحث بھی بامزہ معلوم ہونے لگتی ہے ،
"سرگزشت" میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے ، اور "یاران کہن" تو
زیادہ تر ان شخصیتوں ہی کے لطائف کا تذکرہ ہے ،

لاہور میں جمعیتہ العلما کا اجلاس ہو رہا تھا ، ملک بھر کے
علماء جمع تھے، سالک صاحب نے ان پر ریشتاغ کی پھبتی کسی ، مہر
صاحب نے مولانا ابوالکلام رح سے ذکر کیا ، انہوں نے بہت داد
دی اور کہا کہ لمبی لمبی ڈاڑھیوں کے مجمع کو اس سے بہتر کیا
نام دیا جا سکتا ہے ، واضح رہے کہ ریشتاغ ہٹلر کی پارلیمنٹ کا نام تھا ،

آغاحشر سے ان کی ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی ، جب وہ لاہور
میں مقیم تھے ، دنوں ہی میں گاڑھی چھننے لگی ، آغا بلا کے بذلہ
سنج ، نکتہ طراز ، اور بدیہہ گو تھے ، سالک بھی ان خصوصیتوں میں
پیچھے نہیں تھے ، البتہ آغا صاحب پھکڑ بھی تھے اور گالی گفتار
سے رکتے نہیں تھے ، اہل قلم پر یہ زمانہ کچھ زیادہ مہربان نہ تھا ،
آغا صاحب کا ھاتھ اکثر تنگ رہتا ، جب کہیں سے کوئی رقم آتی
تو دنوں میں لٹا دیتے ، طبیعت سخی اور لکھ لٹ پائی تھی ، سالک
صاحب روایت کرتے تھے کہ وہ اور حشر اُن دنوں مونگ پھلی سے
جیبیں بھر کے آدھی آدھی رات تک لاہور کی بڑی بڑی سڑکوں پر
پھیرے ڈالتے ، اور دنیا بھر کی گپیں ھانکتے تھے ایک روز آغا
صاحب کو کلکتہ سے پانچ ہزار روپیہ آیا ، بہت خوش ہوئے ، تعلیاں
بگھارنا ان کی فطرت میں تھا ، سالک صاحب شام کو ان کے ھاں پہنچے

تو عالم ہی دوسرا تھا، کہنے لگے، آغا حشر ڈرامہ کا خدا ہے، ہندوستان بھر میں کوئی شخص اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، وہ انڈین شیکسپیئر ہے ۔۔۔۔ سالک نے کہا، جیسا تھرڈ کلاس انڈیا ہے ویسا ہی اس کا شیکسپیئر ہو گا؟ بہت بھنائے، چونکہ سالک صاحب سے گالی گلوچ کا لین دین نہ تھا لہذا سٹپٹا کر رہ گئے، کہنے لگے جانتے ہو پانچ ہزار روپے کتنے ہوتے ہیں، سالک نے کہا جی ہاں سنا ہے پانچ ہزار کی چھاؤں میں کتا بیٹھتا ہے، بے اختیار ہنس پڑے، فرمایا مسخرے پن سے باز نہیں آتے،

خواجہ حسن نظامی بھی قدرت سے طباع اور طرار طبیعت لے کر آئے تھے، ان کے ہاں بھی زبان کا زور بندھا ہوا تھا، دہلی مرحوم کی آبرو تھے، جہاں تک ان کی خصوصیتوں کا تعلق تھا وہ کئی خوبیوں کی تصویر تھے، مثلاً پیر بھی تھے، پیرزادے بھی، اخبار نویس بھی تھے اور اہل اللہ بھی، صاحب طرز ادیب بھی تھے اور صوفی با کرامت بھی، تاجر بھی تھے اور سجادہ نشین بھی، گویا ایک ذات میں کئی وجود جمع ہو گئے تھے، شوشہ چھوڑنے مصرعہ اٹھانے، تھگلی لگانے، کرتب دکھانے، پتنگ اڑانے، ناٹک رچانے اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے میں انہیں کمال حاصل تھا، نظام الدین اولیا اللہ کے جوار میں رہ کر ایک دنیا سے لڑائی لے رکھی تھی، مولانا ظفر علی خان کو حیدر آباد سے پٹخنی دلوائی، مولانا محمد علی کے لئے بھڑوں کا چھتا ہو گئے، دیوان سنگھ مفتوں سے تانا ری ری

شروع کی اور آن واحد میں ملہار گانے لگے، مہاتما گاندھی کی چرخ
چون کا بھرکس نکالا، شردھانند کا ٹینٹوا دبایا، شدھی کو ناکوں
چنے چبوائے، تبلیغ کا ڈول ڈالا، انسان کیا! طوفان تھے، سالک
صاحب چونکہ نظام خانقاہی کے خلاف لکھا ہی کرتے تھے اس لئے
ان سے بھی کبھی کبھار چاؤ چونچلے ہو جاتے، خواجہ صاحب
بہر حال ایک زندہ دل اور یار باش شخصیت تھے حجرے میں مجرے
کا جواز بھی پیدا کر لیتے، بھارت بیاکل تھیٹریکل کے ایک نو عمر
اداکار، چونی لال پر خواجہ صاحب کی نظر عنایت ہو گئی، سالک
صاحب کو شوخی سوجھی، تین چار اشعار فارسی میں لکھ کر گمنام
کی طرف سے خواجہ صاحب کو ڈاک میں بھیج دیئے ----

اے خواجۂ نامدار چونی در صحبت گلفدار چونی،
من در ہجر تو ایں چنینم تو در پہلوئے یار چونی،
در حسرت قرب ذات بیچوں اے صوفی ہر زہ کار چونی،

خواجہ صاحب لاہور تشریف لائے تو سالک صاحب نے چونی
لال کا پوچھا، خواجہ صاحب بھانپ گئے، فرمایا اچھا تو وہ اشعار
آپ کے تھے؟

حکیم فقیر محمد چشتی جگراؤں کے تھے، لیکن ان کا وطن ثانی لاہور
تھا، قدرت نے ان میں حذاقت و طبابت کے علاوہ لطافت و ظرافت کا مادہ
کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، پھبتی کہنے اور ضلع جگت میں بے نظیر تھے،
سالک صاحب بھی ان کا لوہا مانتے وہ پھبتی کہتے ہی نہیں اس میں

اصلاح بھی کرتے تھے ، مثلاً سالک صاحب نے ان کی بوقلمونی پر آٹھوں گانٹھ کمیت کی پھبتی کسی ، کہنے لگے کیا سائیسوں کی زبان بولتے ہو ؟

مطب میں حکیم صاحب کے پاس نجو طوائف بیٹھی تھی ، اتنے میں سالک صاحب آ گئے ، حکیم صاحب نے نجو سے کہا ان سے ملو ہمارے شہر کے بہت بڑے ادیب اور شاعر عبدالمجید سالک ہیں ، وہ آداب بجا لائی ، سالک سے کہا کہ یہ لاہور کی مشہور طوائف نجو ہے ، سالک صاحب نے کہا ، نجو ؟ بھلا کیا نام ہوا ، فرمانے لگے لوگ نجو نجو کہہ کر پکارتے ہیں ، پورا نام تو نجات المومنین ہے ، نجو کا کھلا چمپئی رنگ ، سر پہ سفید ریشمی دوپٹہ کناروں پر چوڑا نقرئی ٹھپہ سالک نے کہا ، ملاحظہ فرمایا آپ نے ، ڈبیہ کا انگور ہے ، تشبیہہ تام تھی بہت داد دی ، حکیم صاحب نے فرمایا ،

بھلا اس تشبیہہ کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا ؟

خمیرۂ گاؤ زبان بہ ورق نقرہ پیچیدہ

سالک صاحب پھڑک اٹھے ،

سالک صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کا باغ و بہار ہونا تھا ، مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک دفعہ ان سے پوچھا ، سالک صاحب آپ کو معلوم ہے عربی میں کھٹائی کو کیا کہتے ہیں ؟ جواب دیا حموض ، فرمایا کھٹا کرنا تحمیض کہلاتا ہے ، برے

معنی میں نہیں بلکہ چٹپٹا بنانے کے معنی میں عربی میں ایک قول ہے، حمضوا بجالسکم، اپنی مجلسوں اور صحبتوں کو چٹپٹا بناؤ تو آپ کے آنے سے ہماری مجلس چٹ پٹی بن گئی ، واقعہ یہ ہے کہ سالک صاحب جس مجلس میں ہوتے وہ چٹ پٹی ہو جاتی ، شرکاء مجلس دیر تک لطف اندوز ہوتے ،

ہر شخص کا اندازہ اس کے دوستوں سے کیا جاتا ہے ، سالک صاحب اوائل عمر ہی سے جن لوگوں کے ساتھ رہے وہ قلم کے لئے مایۂ ناز تھے ، اقبال ، ابوالکلام ، ظفر علی خاں ، حسرت موہانی ، ممتاز علی ، جس پایہ کے یہ لوگ تھے وہ ان کے نام اور کام سے ظاہر ہے ، ہم سفروں میں انہیں مہر جیسا رفیق قلم ملا ، ہم نشینوں میں چراغ حسن حسرت ، مرتضیٰ احمد میکش ، احمد شاہ بخاری ، محمد دین تاثیر ، شاگردوں میں احمد ندیم قاسمی اور اولاد میں عبدالسلام خورشید ، تمام عمر قرطاس و قلم میں کٹی ، سالہا سال لکھا اور سالہا سال پڑھا ، اس اعتبار سے وہ ایک تہائی صدی کے ادب و سیاست کی چلتی پھرتی کہانی تھے ، ان کی باتوں سے جی اکتاتا ہی نہیں تھا ، کیا کیا باتیں ان کے سینہ میں نہیں تھیں؟ کتنی ہی باتیں ان کے قلم سے صفحہ کاغذ پر آ گئیں ، کتنی ہی لوگوں کے حافظہ میں بے تحریر پڑی ہیں ، اور کتنی ہی نا گفتنی ہونے کے باعث محفلوں میں اڑتی پھرتی ہیں ، اکثر گفتنی و نا گفتنی وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے ، جس موضوع پر بولتے موتی رولتے۔ ہا ! میر درد

نے کس وقت کہا تھا --------

یا رب وہ ہستیاں اب کس دیس بستیاں ہیں ،
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں ،

" اس بازار میں " میری ایک رسوا سی کتاب ہے ، یہ فحاشی کی تاریخ ہے ، اس کا خیال مجھے ایک فیچر سے پیدا ہؤا جو میں نے چٹان کے سالگرہ نمبر میں لکھا تھا ، سالک صاحب نے زور دیا کہ میں اس فیچر کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے کتاب لکھ دوں ، اس بازار میں پھرتے پھراتے مجھے ایک ایسے گھرانے میں جانا پڑا جس کی سالکن کبھی جوان تھی ایک زمانہ میں علامہ اقبال اس کی آواز سے خوش ہوتے تھے ، اس کا نام امیر تھا ، امیر کا زمانہ لد چکا تھا ، اس وقت ستر پچھتر برس کے پیٹے میں تھی ، چہرے پر جھریوں کی چنٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ لٹے ہوئے عیش کی تصویر ہے ، میں نے ادھر اُدھر کے ٹانکے ملا کر سوال کیا کہ وہ مجھے اقبال کے بارے میں کیا بتا سکتی ہے ؟ لیکن طرح دے گئی ، میں نے اصرار کیا ، اس نے رسید تک نہ دی ،میں نے پچکارنا چاہا وہ ٹال گئی ، ہزار جتن کئیے لیکن کسی طرح بھی ڈھب پر نہ آئی ، جب میں نے سارے داؤں استعمال کر لئے تو خدا کا واسطہ ڈالا ، لیکن اُس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ، جب میں نے عذر و انکار کی وجہ پوچھی تو اُس نے حقے کی نے چھوڑتے ہوئے کہا ،

" ہم لوگ شرفأ کے رازوں کی نمائش یا بیوپار نہیں کیا کرتے ،

آپ خواہ مخواہ ہوا کو مٹھی میں تھامنا چاہتے ہیں "

واپس آکر میں نے سالک صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ امیر کے ذکر سے ششدر رہ گئے ، پوچھا ، ابھی تک زندہ ہے ؟ عرض کیا جی ہاں ، پھر ایک واقعہ سنایا کہ مولانا گرامی لاہور تشریف لائے تو مجھے دفتر سے اٹھا کر علامہ اقبال کے ہاں لے گئے ، علامہ اُن دنوں بازار حکیماں میں رہتے تھے، علی بخش سے پتہ چلا کہ علامہ بیمار ہیں ، دھسہ لیکر لیٹے ہوئے تھے ، ڈاڑھی بڑھی ہوئی چہرہ اُترا ہوا ، آنکھیں دھنسی ہوئیں ، گرامی دیکھتے ہی آبدیدہ ہو گئے ، پوچھا خیریت ہے ، معلوم ہوا کہ امیر کی ماں نے میل ملاقات بند کر دی ہے ، پچھلے تین روز سے ملاقات نہیں ہوئی گرامی کھلکھلا کر ہنس پڑے ، پنجابی میں کہا ،

او چھڈ یار توں وی غضب کرنا ایں ، او تینوں اپنی ہنڈی کس طرح دے دین

(چھوڑو یار تم بھی غضب کرتے ہو، بھلا وہ تمہیں اپنی ہنڈی کیونکر دے دے) علامہ بے حد غمگین تھے ، گرامی نے علی بخش سے کہا ، گاڑی تیار کرو ، مجھے ساتھ لیا اور اُس بازار کو روانہ ہو گئے ، امیر کے مکان پر پہنچے ، دستک دی ، امیر کی ماں نے گرامی کو دیکھا تو خوش دلی سے خیر مقدم کیا ،

آپ اور یہاں —؟ اھلاً و سہلاً

گرامی نے امیر کی ماں سے گلہ کیا کہ تو نے ہمارے شاعر کو

ختم کرنے کی ٹھانی ہے ، اُس نے کہا مولانا شاعروں کے پاس کیا ہے ، چار قافیے اور دو ردیفین ، کیا میں اپنی لڑکی ہاتھ سے دے کر فاقے مر جاؤں ؟ آپ کا شاعر تو ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے ، میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہو گا ؟

گرامی نے اُجلی ڈاڑھی کا واسطہ دیا ، اور دو گھنٹہ کی شخصی ضمانت دے کر امیر کو ساتھ لے آئے ، میں علی بخش کے ساتھ ، گرامی امیر کے ساتھ گھوڑا دڑکی میں چلا آ رہا تھا ، علامہ کے ہاں پہنچے تو گرامی نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ،

اُٹھو جی ، آ گئی امیر ،

سچ مچ ، علامہ نے حیرت سے پوچھا ،

امیر سامنے کھڑی تھی ، دفعتاً اُن کا چہرہ جگمگا اٹھا ، سالک صاحب نے یہ واقعہ سنا تے ہوئے کہا ، زندگی میں اس قسم کی آرزوئیں ناگزیر ہوتی ہیں ، انسان کو ان راستوں سے گذرنا ہی پڑتا ہے ، فرمایا جس زمانہ میں اقبال انارکلی میں رہتے تھے ، ان دنوں لاہوری دروازہ اور پرانی انارکلی میں بھی کسبیوں کے مکان تھے ، ایک دن میں علامہ کے ہمراہ انارکلی سے گذر رہا تھا کہ اچانک وہ ایک ٹکیائی کے دروازہ پر رک گئے ، ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی عورت ، مونڈھے پر بیٹھی حقہ سلگا رہی تھی ، اندر گئے حقہ کا کش لگایا ، اٹھنی یا روپیہ اس کے ہاتھ میں دے کر آ گئے ، میں بھونچکا رہ گیا ، ڈاکٹر صاحب یہ کیا حرکت ؟ فرمایا ، سالک صاحب ،

اس عورت پر نگاہ پڑی تو اس کی شکل دیکھ کر لہر سی اٹھی کہ اس کے پاس کون آتا ہو گا؟ پھر مجھے اپنے الفاظ میں تکبر محسوس ہوا، میں نے خیال کیا کہ آخر اس کے پہلو میں بھی دل ہو گا، یہی احساس مجھے اس کے پاس لے گیا کہ اپنے نفس کو سزا دے سکوں، اور اس کی دل جوئی کروں، یہ عورت صرف پیٹ کی مار کے باعث یہاں بیٹھی ہے، ورنہ اس میں جسم کے عیش کی ادنیٰ سی علامت بھی نہیں ہے؟

سالک صاحب نے علامہ اقبال کے ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا عمر کی آخری تنہائی میں وہ ہر چیز سے دستبردار ہو گئے تھے، ان کے قلب کا یہ حال تھا کہ آن واحد میں بے اختیار ہو کر رونے لگتے، حضورؐ کا نام آتے ہی ان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی، پہروں اشکبار رہتے، ایک دفعہ میں نے حدیث بیان کی کہ مسجد نبوی میں ایک بلی نے بچے دے رکھے تھے، صحابہؓ نے بلی کو مار کر بھگانا چاہا، حضورؐ نے منع کیا، صحابہؓ نے عرض کی، مسجد خراب کرتی ہے، حضورؐ نے فرمایا، اسے مارو نہیں، یہ ماں ہو گئی ہے،

حدیث کا سننا تھا کہ علامہ بے اختیار ہو گئے، ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگے، سالک صاحب کیا کہا؟ مارو نہیں ماں ہو گئی ہے، اللہ اللہ اُسوت کا یہ شرف؟ سالک صاحب کا بیان تھا کہ

حضرت علامہ کوئی پون گھنٹہ اسی طرح روتے رہے، میں پریشان ہو گیا، ان کی طبیعت بحال ہوئی تو مجھے بھی چین آیا، ورنہ جب تک وہ اشکبار رہے میں ہلا رہا گویا مجھ سے کوئی شدید غلطی سر زد ہو گئی ہو،

۱۹۴۶ء میں سالک صاحب نے میری استدعا پر روزنامہ آزاد میں اپنی جیل یاترا پر ایک مضمون لکھا پھر یہی مضمون انہوں نے تفصیلات کے ساتھ ”سر گذشت“ میں تحریر کیا، وہ نومبر ۱۹۲۱ میں زیر دفعہ ۱۵۳ الف گرفتار ہو کر ایک سال قید ہو گئے، لاہور سنٹرل جیل سے میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا۔ جہاں پنجاب اور دہلی کے بہت سے پولیٹیکل قیدی رہ رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اور عبدالعزیز انصاری نے مولانا احمد سعید دہلوی سے ادب عربی صرف و نحو عربی اور منطق کا سبق پڑھنا شروع کیا۔ مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی نماز میں ہم سب کے پیش امام تھے۔ سید حبیب، مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھاتے۔ اور مولانا داؤد سید صاحب کو عربی، نتیجہ یہ ہؤا کہ نہ ان کو انگریزی آئی نہ ان کو عربی، مولانا عبداللہ چوڑی والے، میر مطبخ تھے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی۔ جس میں اختر علی خاں گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری غزل گاتے۔ مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے۔ مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے۔ آہ ان دوستوں میں سے لقاء اللہ کے

سوا ایک بھی حیات نہیں ۔ ع

آن قدح بشکست و آں ساقی نماند

سرگذشت کا زندانی حصہ بڑا ہی دلچسپ ہے ۔ ایک تذکرہ میں کئی تذکرے آ گئے ہیں ۔ حسرت کے الفاظ میں قید کا یہ ایک سال ان کے سوانح حیات کی قیمتی متاع تھا ۔

اس کے بعد کبھی قید نہ ہوئے ۔ زمیندار کو بد مزگی سے چھوڑا ۔ مہر صاحب کی رفاقت میں انقلاب نکالا ۔ جو برطانوی حکومت کے ترک ہندوستان تک چلتا رہا ۔ آزادی کے بعد بھی سال چھ مہینے نکلا ۔ آخر آب و ہوا کو سوافق نہ پا کر بند کر دیا ۔ یہ ذکر اس سے پہلے آ چکا ہے کہ مجید ملک (پرنسیپل انفرمیشن آفیسر) کی تحریک پر حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات و مطبوعات سے منسلک ہو کر کراچی چلے گئے ۔ وہاں فرضی ناموں سے حکومت کی پالیسیوں کے حق میں مضامین لکھتے رہے ۔ بعض سرکاری مطبوعات کے ترجمے کئے ۔ خواجہ ناظم الدین کی تقریریں لکھیں ۔ ملک غلام محمد کا زمانہ آیا تو اسی خدمت پر مامور رہے ۔ کوئی چار سال بعد وہاں سے لوٹے تو یہاں مختلف ادبی و علمی اداروں سے منسلک ہو گئے ۔ منیر انکوائری رپورٹ کا اردو ترجمہ کیا ۔ ایک روز اچانک بیمار ہو گئے اس بیماری نے صحت کی عمارت ہلا دی ۔ دواؤں کے سہارے چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے لیکن اندر خانہ کمزور پڑ گئے ۔ اکثر گھر ہی میں رہتے ۔ وضعداری کا یہ

حال تھا کہ تعلقات بنا کے توڑتے نہیں تھے - میری اہلیہ کو انہی دنوں دماغ کا عارضہ ہو گیا - خود ان کی پوتی کو بھی یہی عارضہ تھا - اس مرض کی اذیت کو سمجھتے تھے - میں اپنی جگہ سخت پریشان تھا - وہ اس زمانہ میں دوسرے تیسرے روز گھر سے نکلتے اور سیدھے میرے ھاں چلے آتے - میری بیوی کے پاس بیٹھ جاتے - اور اس کی طبیعت کو بہلانے لگتے - اس سے کہتے میرے لئے نمکین چائے بناؤ - مطلب اس کو مصروف رکھنے سے تھا - وہ بڑے شوق سے چائے بناتی - گھنٹوں ٹک کر بیٹھے رہتے - مجھے کہتے جاؤ دفتر میں پھیرا ڈال آؤ - میں یہاں بیٹھا ہوں - میری اہلیہ کے دل میں انہوں نے والد کی سی جگہ بنا لی تھی - اور وہ بھی اس کو بیٹی ہی کی طرح دیکھتے بھالتے تھے- ان کی سیرت کا یہ بانکپن میرے دل پر آج تک نقش ہے - کیا وضعداری تھی کہ آج وہ باتیں ہی خواب و خیال ہو گئیں ہیں جس روز ان کا انتقال ہوا اس سے ایک دن پہلے کوئی نو بجے صبح میرے ھاں تشریف لائے - حسب معمول میری اہلیہ کو نمکین چائے بنانے کے لئے کہا - اس نے تیار کر کے پیش کی - تو بہت خوش ہوئے - فرمایا قلچہ ، نمکین چائے ، شلجم اور سفید چاول تو بس کشمیریوں ہی کے ھاتھوں لذیذ پکتے ہیں - چار بجے شام واپس چلے گئے - اگلے روز سنا کہ سالک صاحب فوت ہو گئے ہیں تو یقین نہیں آتا تھا - بھاگم بھاگ مسلم ٹاؤن پہنچا - جس مکان میں ظرافت کے پھول کھلتے تھے وہ ماتم کدہ بنا ہوا تھا - سالک صاحب واقعی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے -

وہ اکا دکا احباب سے مذاق بھی کر لیتے لیکن خاص قسم کی مجلسوں میں جانے اور عام طرز کی محفلیں رچانے کے عادی نہ تھے۔ ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ مثلاً وہ بذلہ سنج ضرور تھے مگر ریسٹورانوں ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں آنے جانے سے متنفر رہے اسے اپنی عمر کی متانت کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ریسٹورانوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھ کر گپ لڑانا واہیات کھیل تھا۔ ایک دفعہ کافی ہاؤس کے پاس سے گذر رہے تھے۔ چراغ حسن حسرت (سند باد جہازی) نے دیکھا تو کرسی چھوڑ کر باہر آ گئے۔ زور دیا کہ اندر چلیں۔ کافی پئیں۔ "حلقۂ رنداں" کو سعادت بخشیں لیکن مطلقاً نہ مانے۔

اس میں عیب کیا ہے؟ حسرت نے کہا

"مجھے عیب ہی نظر آتا ہے!"

حسرت بھی تو ہر روز بیٹھتے ہیں میں نے عرض کیا۔

"ان میں ابھی لڑکپن ہے!"

وہ نوجوانوں کی عزت کرتے لیکن ان سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے جب کبھی انہیں پتہ چلتا کہ حسرت سے نوجوانوں کی بم چخ ہوگئی ہے اور وہ اختلاج کے مریض ہیں جس سے ان کی حساس طبیعت متاثر ہوئی ہے تو وہ انہیں ٹوکتے کہ ہاتھیوں کی اس ڈار یا کبوتروں کی اس ٹکڑی میں

کیا رکھا ہے ؟ گھر میں رہا کرو ۔ لیکن حسرت صاحب کو کافی ہاؤس کا چسکہ پڑا ہوا تھا ۔ وہ اس ریوڑ یا گلے میں ضرور آتے اور بلا ناغہ آتے ۔ جان لیوا مرض میں بھی آتے رہے ۔ حالانکہ چیر غٹو اور اول جلول قسم کے نوجوانوں سے اُلجھ کر دل آزردہ ہوتے تھے ۔ حسرت بڑے پائے کے مطائبات نگار تھے۔ با محاورہ زبان لکھنے میں بے مثال تھے۔ ادب و شعر کا ذوق نہایت شستہ و رفتہ پایا تھا ۔ ان کے سامنے غلط اُردو لکھنا یا غلط اُردو بولنا مشکل تھا ۔ وہ بر خود غلط لوگوں کو چٹکیوں میں اڑا دیتے ۔ برگزیدہ ادیب اور کہنہ مشق صحافی ہو کر بھی انہیں شاعرانہ عیبوں سے لگاؤ تھا اس کے بر عکس سالک صاحب نے عمر بھر شراب چکھی نہ کوچۂ یار میں گئے ۔ رنگ رلیاں منائیں نہ گلچھرے اڑائے ۔ انہیں نسوانی موسیقی سے بھی کوئی خاص دلچسپی تھی نہ اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوتے ۔ خود شاعر تھے ۔ جب انقلاب سے سبکدوش ہوگئے اور کراچی سے واپس آ گئے تو شعر کہنے کا شوق تازہ ہوگیا ۔ مشاعروں میں جانے لگے ۔ آواز رسیلی پائی تھی ۔ ترنم سے پڑھتے ۔ لوگ ان کا احترام کرتے لیکن یہ دور ان کے مشاعروں میں جانے کا نہیں تھا ۔ مشاعروں پر کھلنڈرے شاعر اور تان سینی گلے چھائے ہوئے تھے جنہیں زبان کی نزاکتوں سے واجبی سا تعلق تھا انہیں نثر و نظم دونو میں زبان و بیان کی پابندیوں کا احساس رہتا بلکہ اس بارے میں اہل زبان سے بھی زیادہ سخت تھے ۔ وہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی طرح " ہم جائز سمجھتے ہیں " کے مرض کا

شکار نہیں تھے - بلکہ الفاظ اور محاورات کو اصل کی طرح استعمال کرتے - وہ ضرورت کے مطابق ان میں ترمیم کے بھی خلاف تھے - ان کے نزدیک یہ بد مزاقی تھی - ترقی پسند تحریک کی انہوں نے بڑی سرپرستی کی - اور اس کی وجہ غالباً احمد ندیم قاسمی تھے - لیکن نہ تو کبھی ان کے اجتہاد کو قبول کیا نہ زبان کے معاملہ میں ان لوگوں کی بے راہ روی کو پسند فرمایا - اور نہ ان کے اُن با پردہ الفاظ و تراکیب کی حوصلہ افزائی کی - جن کی آڑ میں یہ لوگ خدا و مذہب کی تضحیک کرتے تھے -

میں نے اپنی کسی نظم میں مشیت کو تماشائی لکھا - فرمایا یہ نہ لکھا کرو - مشیت اللہ کی رضا اور اس کے ارادہ کا نام ہے - ترقی پسندوں کو معلوم ہے کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اور یہاں اسلام کو اولیت حاصل ہے وہ کھل کے خدا کو گالی نہیں دے سکتے - انہوں نے استخفاف کے لئے مشیت کا لفظ انتخاب کر لیا ہے -

ترقی پسند ادیبوں کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایک زور دار خطبہ پڑھا ، لیکن ان کے نظریات و تصورات کو اسلامی معاشرہ کے لئے مضر سمجھتے تھے ، البتہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم طبقاتی اونچ نیچ اور سرمایہ دارانہ استحصال کے سخت خلاف تھے ، اس سلسلہ میں ترقی پسندوں کے احساس و اظہار کی تعریف کرتے ، مگر ان کا خیال تھا کہ ان ادیبوں اور شاعروں میں پچانوے فی صد موت سے پہلے مر جائینگے ، باقی پانچ فیصد میں سے نصف وہ ہیں جن کے ادب میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہی نہیں ، ان کا خیال تھا

کہ ادب و فن کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا نام ترقی پسندی ہے۔
وہ ان کی زبان اور ان کے اسلوب سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے البتہ
خیالات کے اس حصہ کی تعریف کرتے جس میں طبقات کے خلاف
جد و جہد کا حوصلہ پایا جاتا اور محنت کشوں کو ان کا حق دلوانے
کی امنگ ہوتی۔ وہ نعرہ بازی کے سخت خلاف تھے۔ ان کا
نظریہ تھا کہ نفرت ادب کو ہلاک کر دیتی ہے۔ وہ نئی پود کی
خودرائی سے بیزار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نفرت کا جواب نفرت
نہیں اور نہ موجودہ نوجوان سرزنش یا تادیب سے سمجھنے کے ہیں۔
ان کے نزدیک تجربہ بہترین اُستاد ہے۔ فرماتے جس ادب میں زندہ رہنے
کی خو بو ہی نہیں اور جو محض سیاسی نعروں سے پیدا ہوا ہے اس
سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ بلکہ اس کو حالات کے سپرد کر دینا چاہئے۔
جونہی یہ حالات ختم ہوں گے اس قسم کا ادب بھی ختم ہو
جائے گا۔

انہیں یہ احساس بھی تھا کہ ادیبوں کی نئی پود کے خیالات
منہ زور ہیں لیکن زبان کمزور ہے۔ چنانچہ فن کے تسامحات پر وہ
اکثر روشن آثار نوجوانوں کو ٹوک دیتے۔ ایک دفعہ تاثیر
نے ان سے کہا سالک صاحب کیا "ہم نے جانا ہے یا ہم نے کرنا
ہے" لکھنا درست ہے۔ فرمایا خلاف محاورہ اہل زبان ہے۔ مجھ کو
جانا ہے۔ مجھ کو کرنا ہے۔ درست ہے۔ تاثیر نے کہا میں نے
اپنی تحریروں میں اس قسم کے فقرے لکھے ہیں۔ اہل زبان اعتراض
کرتے ہیں۔ کیا جواب دوں؟ سالک صاحب نے کہا، غلطی کا

جواب کیا ہو گا ۔ صاف کہئے ، کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ۔ تاثیر راضی نہ ہوئے ۔ اصرار کرنے لگے ۔ کوئی ایسا جواب بتائیے جو بظاہر معقول ہو ۔ سالک صاحب نے کہا وہ تو محض سخن طرازی یا کج بحثی ہو گی ۔ تاثیر نہ مانے ، ضرور کوئی جواب ہونا چاہئے ؟ انہوں نے کہا ، تو آپ یہ کہئے کہ ''نے'' علامت فاعلی ہے اور کو علامت مفعولی ۔ اگر جانا ہے کا فاعل میں ہے تو اس کے بعد ''نے'' ہی درست ہے ''کو'' کیونکر درست ہو سکتا ہے ؟ تاثیر سن کر اچھل پڑے ۔ بس ٹھیک ہو گیا ۔ اب ان زبان والوں سے نپٹ لوں گا ۔ سالک صاحب نے کہا ، لیکن محاورے کے اعتراض کا جواب قواعد سے اور قواعد کے اعتراض کا جواب محاورے سے دینا اصول لسانیات کے خلاف ہے تاثیر کہاں مانتے وہ خود ترقی پسندوں کے آدم تھے لیکن ان کی جنت سے نکالے جا چکے تھے ۔

فی الجملہ سالک صاحب ایک زندہ دل ۔ بذلہ سنج ۔ کہنہ مشق خوش گفتار ۔ پاک سیرت ۔ نیک سرشت ۔ دوست نواز ۔ صاحب طرز اور نکتہ طراز ادیب تھے ۔ تقریباً نصف صدی تک قلم کا ساتھ دیا ۔ زندگی بھر ہزاروں صفحات لکھ ڈالے ۔ انقلاب کے بیس بائیس سال کے فائل ہی گواہ ہیں ۔ ہمیشہ قلم برداشتہ لکھتے ۔ صبح سویرے لکھتے ۔ اور گاؤ تکیہ پر ٹیک لگا کر لکھتے ۔ خط اتنا خوب صورت تھا کہ موتی پروتے ۔ مولانا ابوالکلام نے ایک دفعہ ان کے خط کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا سالک صاحب ۔ مہر صاحب کا خط بھی آپ ہی لکھ دیا کریں ۔ مہر صاحب کا خط شکستہ تھا —

مسودات عموماً پنسل سے لکھتے۔ سفارت خانوں کے خبر ناموں کی سلپیں بنا کر عمر بھر ان کی پشت پر افکار و حوادث لکھتے رہے۔ یاران کہن کا تمام مسودہ پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ فرماتے میرے لئے صبح سویرے ناشتہ کرنا مشکل ہے۔ افکار و حوادث یا شذرات لکھنا مشکل نہیں وہ اتنا ہی سہل ہے جیسے چائے پی لی۔ سگریٹ سلگا لیا۔

سرگذشت کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا۔

آج سرگذشت ختم ہوتی ہے۔ ۱۵ اگست کو پاکستان قائم ہو گیا۔ اس وقت کے بعد کی سرگذشت لکھنا بے حد دشوار ہے۔ میں ابھی اپنے دل و دماغ اور اپنے قلم میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اور بساط سیاست پر شاطرین نے جو چالیں چلیں۔ اُن کو قلمبند کر سکوں اور شائد اس سرگذشت کو فاش انداز میں لکھنا مصلحت بھی نہیں۔ اگر چند سال حیات مستعار باقی ہے تو انشا اللہ سرگذشت کا دوسرا حصہ بھی مرتب ہوگا۔ اور لکھنے والا ہی نہ رہا تو اللہ اللہ ۔۔۔ کار دنیا کسے تمام نکرد

آخر ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو اس سرگذشت کا "تمت بالخیر" ہو گیا۔ اللھم اغفر لہ

چراغ حسن حسرت

ادب کی عام گفتگو میں حسرت اپنے سوا شاذ ہی کسی کو مانتے تھے۔ مزاج اُن کا یہ تھا کہ نئی پود کا ذکر خیر کرتے ہوئے ہچکچاتے۔ ہمعصروں میں دو چار کی تعریف کرتے لیکن مین میخ ان میں بھی نکالتے۔ یہ ان کی طبعیت کا ایک انداز تھا۔ یا شائد ہمیں لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح وہ اپنا ادبی دبدبہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی زبان سے ہم نے جن لوگوں کی تعریف سنی۔ علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، نواب نصیر حسین خیال مولانا ظفر علی خاں، یہی دو چار بزرگ تھے لیکن ان کے دل میں ہوتا ہواتا کچھ نہیں تھا۔ محض ان کی ادبی انا کا نخرہ تھا۔

لاہور میں ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ ہوٹلوں میں کٹا۔ پہلے عرب ہوٹل میں بیٹھا کرتے اور اسلامیہ کالج کے نوجوانوں سے محفل لگاتے تھے۔ جنگ کے بعد — جب سبکدوش ہو کر واپس آئے۔ پاکستان بنا۔ امروز نکلا تو انہوں نے کافی ہاؤس کو منتخب کیا۔ مرتے دم تک یہیں نشست جاتے رہے۔ یہاں زیادہ تر سیاسی لوگ ان کے گرد بیٹھتے اور مطائبات سے متمتع ہوتے تھے۔ ان نوجوانون سے ان کی جھڑپیں بھی ہوتیں۔ چہلیں بھی۔ چوچلے بھی اور پھبتیاں بھی۔ لیکن پلڑا انہی کا بھاری رہتا۔ کیونکہ ان پر طنز کرنا مشکل تھا۔ اس میدان میں وہ زچ ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔ انہیں الفاظ کے تنوع پر اتنا عبور تھا کہ پہلو دار طنز کرتے وقت وہ بال برابر بھی چوکتے نہیں تھے۔ ادبی یا سیاسی مباحث کا لطف لینے کے لئے وہ ضرور چٹکی لیتے اور بھری مجلس کو اس ڈھب پر لے آتے کہ دیر تک سماں بندھا رہتا۔ ان میں ادب کا ذوق معراج پر تھا۔ زبان و بیان دونو کے دھنی تھے۔ نثر و نظم ان کے مرکب تھے۔ اسی کمال فن نے ان میں انا پیدا کی۔ اس انا کی بدولت خوردوں سے بھی گاہے ماہے الجھ پڑتے۔ جس کا بعد میں انہیں افسوس ہوتا۔ دل ان کا آئینہ تھا۔ ان کے قلم میں دل آزاری نہیں تھی۔ یہی حال ان کی زبان کا تھا۔ بات چیت میں پھبتیوں کی جھاڑ باندھنے کے باوجود لہجہ کی آبرو قائم رکھتے۔ تاہم اس قسم کی باتیں ضرور کر جاتے جس سے کسی خورد کی تحقیر ہو اور وہ احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان نوجوانوں میں ان کا احترام بہت زیادہ تھا۔ لیکن کبھی کبھار

وہ خود ہی انہیں کشیدہ ہونے کا موقع دے دیتے۔ ہم لوگ تو خیر ان کے نیاز مند تھے ان کی انا کو سینا سمجھکر پرے پرے رہتے لیکن جو نوجوان ان کے بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگرد تھے یا جن کے ساتھ وہ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہتے ان سے بھی زبان و ادب کے معاملہ میں تو تکار پر اتر آتے اور وہ جلی کٹی سناتے کہ بسا اوقات انہیں خود بھی جلی کٹی سننی پڑتی تھیں۔ جس زمانہ میں عرب ہوٹل میں بیٹھتے تھے ان سے نیاز نہیں تھا۔ شناسائی ہوئی تو مذاق مختلف تھا۔ ہم سگریٹ تک نہیں پیتے تھے۔ اور ان کے ہاں بادۂ دوشینہ چلتا تھا۔ جن نوجوانوں کو طالب علمی میں شراب کی لت پڑی وہ اُسی کا ہو گیا اور کئی ایک تو اس کے ہاتھوں غرق ہو گئے۔ اس عمر کی شراب جوانی ہی میں ہڈیوں کو بوڑھا کر دیتی ہے۔

لیکن عرب ہوٹل کی ان نشستوں کا زمانہ مالی اعتبار سے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ فقر و فاقہ کے دن تھے۔ اخباروں کا حال بھی پتلا تھا۔ دو دو تین مہینوں کے بعد پندرہ بیس روز کی تنخواہ ملتی۔ بہر حال اونے پونے بسر ہوتی اور وہ لوگ اس پر بھی مزے میں تھے۔ عرب ہوٹل میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ مالکوں کو بھروسہ تھا کہ رقم آئے گی تو مل جائے گی۔ کئی کئی مہینے تنخواہ کا انتظار رہتا۔ جونہی رقم آتی بل ادا ہو جاتا۔ البتہ شراب کا معاملہ غالب کی طرح ذرا ٹیڑھا تھا۔ کہیں سے روپیہ آ گیا تو بری بھلی شراب خرید لی۔ لیکن اس زمانہ میں اہل قلم اپنی گرہ سے کم ہی پیتے تھے۔ طلبہ مدارات کرتے یا پھر ہم نوالہ و ہم پیالہ

دوست ! ضروری نہ تھا کہ عمدہ قسم کی شراب ہو۔ جوانی میں ٹھرا بھی کھرا ہوتا ہے۔ حسرت صاحب اُن دنوں جوان تھے۔ ساتھی اور بھی جوان، نشہ کا سوال تھا۔ پیتے اور ڈٹ کر پیتے، ان کے ایک جگری دوست شیخ غلام محمد تھے۔ ان کے ھاں اس قسم کی صحبتیں رہتیں۔ دونو ایک دوسرے کے لئے ناگزیر تھے اور شاید حسرت کے احباب میں ان سے زیادہ مخلص دوست آخری وقت تک کوئی نہ رہا۔

دوسری جنگ عظیم چھڑی تو حسرت صاحب کی تنگی کے دن ہوا ہو گئے۔ وہ فوج میں بھرتی ہو کر ملک سے باہر ملایا اور سنگا پور چلے گئے۔ فوجی گزٹ کے ایڈیٹر رہے۔ جنگ ختم ہوئی تو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہوگئے۔

جنگ چھڑتے ہی سب سے پہلے مجلس احرار نے برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کے خلاف نعرہ جہاد بلند کیا حسرت صاحب عرب ہوٹل سے اُٹھ کر دفتر احرار میں پہنچے۔ ہم لوگ جیلوں میں جانے کے لئے پا بہ رکاب تھے۔ کہنے لگے ثابت ہو گیا ہے کہ احرار ہی جواں مرد ہیں۔ ع

کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

کانگریس ابھی تک منقار زیر پر ہے اور گاندھی جی ''میں میں'' کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ سے توقع ہی عبث ہے احرار نے اپنے نام کی لاج رکھ لی ہے۔ یہی وقت ہے جب انگریزوں کو ضرب لگائی

جا سکتی ہے -

اب جو ۱۹۴۵ء کے شروع میں ہم لوگ رہا ہو کے باہر نکلے تو کائنات ہی بدلی ہوئی تھی - پانچ سال میں ایک انقلاب آ چکا تھا - کچھ معلوم نہ تھا کہ باہر کیا ہو چکا ہے - اخبارات سے بڑی بڑی خبریں معلوم ہوتی رہیں - باہر آ کر دیکھا کہ عرب ہوٹل میں حسرت صاحب میجر کی وردی پہنے براجمان ہیں - معلوم ہوا فیض احمد فیض ، مجید ملک ، چراغ حسن حسرت اور حفیظ جالندھری فوج میں چلے گئے تھے - حفیظ جالندھری تو خیر فوج کے ہاتھ میں نہیں تھے بھرتی کے کسی شعبہ میں فیلڈ پبلسٹی کے ڈائریکٹر تھے - لیکن پہلے تینوں فوج کے عہدوں پر تھے - بھرتی ہوئے تو معاش کا سوال در پیش تھا - دو سال بعد جنگ پیپلز وار ہو گئی - تو ان کے لئے بھی جواز پیدا ہو گیا اور فیض صاحب کے ساتھ حسرت صاحب بھی جنتا کی جنگ کے مالہ و ما علیہ پر گفتگو کرنے لگے - بڑے اعتماد سے فرماتے کہ برطانوی جمہوریت (اب ملوکیت کے لفظ کو حذف کر دیا تھا) کے مقابلہ میں نازیت یا فسطائیت کا قلع قمع کرنا اشد ضروری تھا - ہٹلر کا وجود انسانیت عظمیٰ کے لئے انتہائی خطرناک تھا وغیرہ - حسرت صاحب خود اس حجت مستعار کی خوبی سے بخوبی آگاہ تھے - ہم پر کیا اثر ہوتا ؟ البتہ جو چیز بھلی نظر آئی وہ ان کے بالا بلند جسم پر میجر کی وردی تھی کہ ان کے بدن پر کھلتی اور کھلتی تھی -

اس جنگ اور عہدہ نے حسرت صاحب کو اپنی عادتوں میں

اور پختہ کر دیا ، وہ ٹھرے سے نکل کے اعلیٰ شرابوں کے رسیا
ہو گئے ، پاکستان بنا تو محکمہ بحالیات کے ہفتہ وار اخبار مہاجرین
میں چیف ایڈیٹر ہو گئے ، اسی اثناء میں میاں افتخار الدین نے امروز
کی نیو رکھی ، فیض کو اس کا چیف ایڈیٹر بنایا ، حسرت ایڈیٹر
ہوگئے ، ان کے معاونین میں پروفیسر محمد سرور اور ایوب کرمانی کے
علاوہ نوجوانوں کی ایک مستعد جماعت شامل تھی ، پہلے شمارہ کا
اداریہ فیض صاحب نے لکھا ، یہ اداریہ انگریزی میں سوچا اور اُردو
میں لکھا گیا تھا ، حسرت روز مرہ اور با محاورہ اُردو کے علمبردار
تھے ، کئی روز اس اداریے پر جز بز رہے ، کھل کے کہنا تو ذرا
مشکل تھا کیوں کہ افتخار الدین کا اخبار تھا ، اور فیض اس وقت
ان کے دست راست تھے بلکہ انہی کی تحریک پر حسرت صاحب کو
امروز میں لیا تھا ، لیکن حسرت رکتے بھی نہیں تھے . کسی نے
سرگوشی کے انداز میں کہا ، انہوں نے ببانگ دھل کہہ ڈالا ،
کسی نے سرسری طور پر استفسار کیا ؟ انہوں نے تفصیل بیان کر
ڈالی ، غرض نوالے توڑتے رہے ، میں نے روزنامہ آزاد میں اس
اداریہ پر لکھا ، کہ اظہار کی زبان اور خیال کی زبان میں تضاد پایا
جاتا ہے ، حسرت صاحب کو اور کیا چاہئے تھا گویا تائید ہو گئی
نتیجہ یہ نکلا کہ فیض صاحب اداریہ نویسی سے دستبردار ہو گئے
کچھ دنوں بعد پیشانی سے اُن کا نام بھی اُڑ گیا ، پہلے ترتیب یوں تھی ،
فیض احمد فیض ، چراغ حسن حسرت ، محمد سرور اور ایوب کرمانی ،
اب حسرت صاحب کا نام اول ہو گیا ، سرور صاحب کے حصہ

میں اداریہ نویسی آئی ، کرمانی صاحب کے حصہ میں شذرات
اور حسرت صاحب کے حصہ میں حرف و حکائت ، حسرت صاحب نے
سرور صاحب سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کی ، وہ انہیں یہ جتانا چاہتے
تھے کہ میں آپ کا ایڈیٹر ہوں ؟ سرور صاحب کہتے تھے کہ آپ امروز
کے ایڈیٹر ہیں میرے ایڈیٹر نہیں ؟ حسرت صاحب فرماتے جی نہیں
مولانا ، (مولانا ان کا تکیہ کلام تھا اور الف کو کش کی طرح لمبا
کھینچتے تھے) ذمہ داری میری ہے ، میرا کام ہے کہ اداریہ کے
مندرجات کا جائزہ لوں ، اس کی زبان دیکھوں ، سرور صاحب کو
اپنی سیاسی سوجھ بوجھ پر اعتماد تھا ، وہ اس قسم کی بات سننے کو
تیار نہ تھے ، آخر انہوں نے حسرت صاحب کی جلی خواہش اور
افتخار الدین کی خفی خواہش سے عاجز آ کر استعفیٰ دے دیا ، جو
فوراً ہی منظور کر لیا گیا ، ان کے بعد ایوب کرمانی ہدف بنے ، وہ
ترقی پسند مصنفین کے ہم عقیدہ تھے لیکن میاں افتخار الدین نے
اڑنگے پر لا کر وہ پٹخنی دی کہ ان لوگوں سے دل برداشتہ ہو کر
کراچی چلے گئے ، وہاں سندھ گورنمنٹ میں ڈائریکٹر انفرمیشن ہو
گئے ، شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی ، ایک روز زیادہ پی
کر ہوٹل کی چھت سے چھلانگ لگا دی اور جاں بحق ہو گئے ،
رفتہ رفتہ امروز کا ابتدائی سٹاف رخصت ہو گیا ، ان کی جگہ سند یافتہ
کیمونسٹ آ گئے ، ایک دن پتہ چلا کہ حسرت صاحب اور
افتخار الدین میں بھی ٹھن گئی ہے ، میاں صاحب خود تو سامنے
نہیں آتے جیسا کہ ان کی عادت ہے البتہ اپنے نائبوں کو اخراج کی

مہم پر لگا دیا ہے ، نزاع کا اصل سبب کیا تھا ؟ روائیتیں بہت سی ہیں ، لیکن ایک سبب ترقی پسند مصنفین بھی تھے ، ان کی لاہور میں کانفرنس ہوئی ، حسرت استقبالیہ کے صدر تھے ، انہوں نے جو خطبہ پڑھا وہ صرف لاہور کے متعلق تھا ، لیکن اس کے مندرجات ترقی پسندی کے موافق مزاج نہ تھے ، اس کے علاوہ اس میں ترقی پسندوں کا ذکر تک نہیں تھا ، نزاع کا دوسرا سبب یہ تھا یا اس دوسرے سبب میں کئی اسباب مضمر تھے کہ حسرت صاحب چٹکی لینے اور پھبتی کسنے سے باز نہیں آتے تھے ، چونکہ زود رنج تھے لہذا ذرا سی بات سے ان کا دل مرجھا جاتا ، میاں افتخار الدین یا ان کے حواریوں کی اناپ شناپ باتیں ان کے کانوں تک پہنچتیں یا انہیں احساس ہوتا کہ ان لوگوں میں دولت کا گھمنڈ گھسا ہوا ہے تو ان پر حاضر و غائب پھبتیاں کستے ، چٹکلے چھوڑتے ، سامنے ہوتے تو چٹکی لیتے ، غیر حاضری میں طعن توڑتے یا فقرے چست کرتے ، جو بہر حال ان تک پہنچ جاتے ، مثلاً میاں افتخار الدین سے کوئی بات ایسی سر زد ہو گئی جو ان کی منشا کے خلاف ہے تو اس پر بگڑ جاتے ، اب انہی کے دفتر میں بیٹھ کر انہی کے خلاف تبصرہ ہو رہا ہے - ترکیبیں وضع کی جا رہی ہیں - فقرے گھڑے جا رہے ہیں - طنزیں چلی آ رہی ہیں - یار لوگ اس وقت تو سنتے اور سر دھنتے - لیکن پھر میاں صاحب تک پہنچا آتے میاں صاحب دل میں گرہ باندھ لیتے - حسرت صاحب دل کا غبار نکال کے صاف ہو جاتے - میاں افتخار الدین کے ہاں معافی کا خانہ ہی نہیں تھا پھر

حسرت صاحب کسی کا برا نہ چاہتے تھے وہ برائی کے اہل ہی نہ تھے۔ اُنہیں غصہ ضرور آتا لیکن اس کی ایک عمر ہوتی ، ایک دن دو دن ، وہ ہفتہ عشرہ تک کسی شخص سے مستقلاً لڑائی باندھ ہی نہ سکتے تھے - اسی اثنا میں میاں افتخار الدین کی زبان سے نکل گیا -

حسرت صاحب آپ مذہبی اُردو لکھتے ہیں -

حسرت صاحب تاڑ گئے کہ انہیں یہ پٹی پڑھائی گئی ہے اور کس نے پڑھائی ہے - بھڑک کر بولے !

میاں صاحب ! یہ مذہبی اردو کیا ہوتی ہے ؟ معلوم ہوتا ہے آپ سے کسی مذہبی سکھ نے روائت کی ہے ! ------------

سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے ، معاف کیجئے میاں صاحب زبان ہر ایرے غیرے بیچ کلیان کے بس کا روگ نہیں ، آپ نے اردو میں کتنی کتابیں پڑھی ہیں ؟ اسکول کالج میں تو آپ انگریزی پڑھتے رہے - پھر ایک لمبا سا کش اور پھر وہی کچکوکے ، اجی میاں صاحب! یہ لڑکے حقے کی نے ہیں - آپ کے منہ لگے ہوئے ہیں - آپ کو فرصت کہاں کہ امروز پڑھیں - جو کچھ آپ کے کان میں ڈال دیا آپ نے آویزہ بنا لیا - انہیں تو اپنے نام کے ہجے نہیں آتے رہ گئے معانی تو وہ انہیں کیا معلوم ؟ ان کے ابا جان بھی نہیں جانتے ؟ بھلا ان سے اپنے ہی نام کے معانی پوچھئے - بتا دیں تو میں اپنی زبان گدی سے نکلوا دوں گا - غضب کرتے ہیں میاں صاحب آپ ! لسانیات پر بھی سیاسیات کی طرح بلا سوچے سمجھے

طبع آزمائی فرما رہے ہیں آپ ؟

اب میاں افتخار الدین جان چھڑانا چاہتے ہیں اور چھوٹتی نہیں۔ خیر وہاں سے اُٹھ کر حسرت صاحب اپنے دفتر میں آ بیٹھے۔ چپڑاسی سے کہا حافظ یوسف کو بلاؤ۔ حافظ صاحب آ گئے۔

سنا آپ نے ؟ میاں صاحب کیا فرماتے ہیں ؟ سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ سرد آہ کھینچی، مونچھوں کو تاؤ دیا، قصہ بیان کیا، قلم کو میز پر رکھا، سلیپر اُٹھا کر پرے پھینکدیں۔

اجی، چھوڑئیے — نا قدروں کے پاس کیا رکھا ہے ؟ میاں افتخار الدین تو دولت کا حادثہ ہیں۔ ان سے شالا مار کے آموں کی فصل کا حال پوچھئے۔ یہ کیا جانیں کہ زبان کیا ہے ؟ ادب کسے کہتے ہیں ؟ شعر کس باغ کی مولی ہے ؟ پورا دفتر سن رہا ہے اور یہ تمام باتیں بہر حال میاں صاحب تک پہنچ جاتی ہیں۔

"حافظ جی، آج حرف و حکائت نہیں ہونگے۔ محرم علی سے کہدو طبیعت منغض ہو گئی ہے۔ میاں صاحب کی صورت دیکھنے کے بعد قلم میں شگفتگی کیونکر رہ سکتی ہے" ؟

دفتر سے اُٹھ کر کافی ھاؤس میں محفل لگی ہوئی ہے۔ اور ذکر وہی میاں افتخار الدین کا ہو رہا ہے۔

(ملک اسلم حیات سے) - - - - - - - غور فرمائے ملک صاحب ! میاں صاحب سیاسیات میں تو کہیں ٹکے نہیں۔ اب لسانیات میں بھی قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور زبان کے معاملہ میں مشورہ دے رہے

ہیں - ہمارے زوال کی بھی انتہا ہو گئی - کہاں مولانا ابوالکلام آزاد ، آقائے موید اسلام ، نواب نصیر حسین خیال اور مولانا ظفر علی خاں ، کہاں میاں افتخار الدین کہ ا آم ، ب بلی ، پ پنکھا ، ت تیتر نہیں جانتے -

---

ایک دن میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ حسرت صاحب کا فون آ گیا -

شورش صاحب ہیں ؟

" میں بول رہا ہوں "

" میں امروز سے حسرت بول رہا ہوں "

" ارشاد "

بھئی ذرا فوراً ہی چلے آؤ "

" خیریت ہے "

" بس چلے آؤ "

پہنچا تو معلوم ہؤا کہ میاں افتخار الدین شوشہ چھوڑ کر نکل گئے ہیں ، سید امیر حسین شاہ سے حسرت صاحب کی تونکار ہو گئی ہے اور اس تونکار کے ذمہ دار وہی کیمونسٹ نوجوان ہیں ،

" کیا ہوا مولانا " ؟

سرمایہ و محنت پر ایک لیکچر پلا ڈالا - سید امیر حسین شاہ صاحب پر برستے رہے ، ایک ہی سانس میں میاں افتخار الدین کی کتھا سنا ڈالی ، حاصل کلام یہ کہ حسرت صاحب نے عملہٗ تحریر میں میاں صاحب اور شاہ صاحب کی در اندازی کو اپنے حقوق میں مداخلت

سمجھا ، جانبین میں تلخی ہو گئی ، حسرت صاحب نے جوش میں
آ کر استعفیٰ دے دیا ، اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں ؟
میاں صاحب پہلے ہی سے منتظر تھے ، بلکہ یہ سب کچھ اسی لئے ہو
رہا تھا ، حسرت صاحب نے دیکھا کہ استعفیٰ منظور کیا جا رہا
ہے اور یہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ان لوگوں کے
دیدے اتنی جلدی پٹم ہو جائیں گے ، انہوں نے تو محض
دھمکانے کے لئے استعفیٰ دیا تھا ، اب شاہ صاحب کی خواہش ہے
کہ حسرت صاحب چلے جائیں ، حسرت ڈٹے ہوئے ہیں کہ نہیں
جائیں گے ، دیکھیں بھلا کون نکالتا ہے ؟ مجھے اور شیخ غلام محمد
کو اسی لئے یاد کیا گیا تھا ، ادھر حسرت صاحب کے دماغ میں
خوف تھا ادھر مالک ، دفتر میں دم بخود بیٹھے ادھر اُدھر فون کر
رہے تھے ،کہ حسرت صاحب بپھرے بیٹھے ہیں انہیں سمجھاؤ میں نے
حسرت صاحب سے کہا کہ اس بد مزگی کے بعد ان کا یہاں رہنا
مناسب نہیں ، جب استعفیٰ ہی دے دیا تو پھر ضد کیسی ؟ مالک
تو بہر حال وہی لوگ ہیں ، آپ زیادہ سے زیادہ اپنے واجبات کی
وصولی کا مطالبہ کر سکتے ہیں ، یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور
وہ در و دیوار پر حسرت کی نظر کرتے ہوئے امروز کا پنڈ چھوڑ گئے اور
اس طرح امروز کا وہ ادارہ تحریر کھنڈ گیا جس سے اس کے سفر کا
آغاز ہوا ،

فیض مقدمہ سازش راولپنڈی میں ماخوذ ہو کر قید ہو گئے ،
پروفیسر محمد سرور مرکزی مطبوعات کے محکمہ میں چلے گئے ، ایوب

کرمانی حکومت سندھ کے انفرمیشن ڈائریکٹر ہوگئے ، حتیٰ کہ بادہ نوشی جان لیوا ہوگئی ، حسرت یہاں سے ریڈیو پاکستان میں گئے ، وہاں ذوالفقار علی بخاری کی بالا دستی راس نہ آئی الگ ہو گئے اور ایک امریکن فرم کے دارالترجمہ سے رشتہ جوڑ لیا ،

میرے تعلقات کا صحیح آغاز اسی زمانہ میں ہوا ، بیس بائیس برس کی شناسائی تھی لیکن اس میں گاؤ نہ تھا ، کھچاؤ تھا ، اس کھچاؤ کی وجہ بھی حسرت صاحب کا مزاج تھا ، نہ وہ خاطر میں لاتے نہ ہم رسید دیتے ، وہ اور بھی چڑتے ، بہر حال ہم بھی اُن سے کچھ زیادہ خوش خاطر نہ تھے ، وہ ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ رہتے جن سے اس خاکسار کی آویزش ہوتی ، ایک دفعہ راقم الحروف نے ایک ایسے مہربان پر طبع آزمائی کی جس کی زبان دوستوں کے خلاف کترنی کی طرح چلتی تھی ، اور انگریزوں کے وقت سے پولیس کا مخبر تھا ، حسرت صاحب بعض غزل گو شاعروں کو لے کر ان کے دفاع میں آ گئے ، شراب کی ایک محفل میں رات بھر اس نظم کا جواب ہوتا رہا لیکن گیارہ شعر نہ ہو سکے ۔ ان چار شاعروں نے بھی جو کچھ لکھا وہ محض دشنام کی پوٹ تھا ۔ تاثیر مرحوم سے ان کی قلمی جنگ ہوئی تو راقم الحروف نے تاثیر کا ساتھ دیا ۔ نصف کلام اس احقر کا تھا ۔ حسرت کے ساتھ احمد ندیم قاسمی اور سیف الدین سیف تھے ۔ اس قسم کی جنگوں میں یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ کس کا پلڑا بھاری رہا ۔ کیونکہ غزل یا نظم میں ندرت خیال

اور حسن اظہار دونو کو ملحوظ رکھا جاتا ہے ۔ جہاں تک طنزیہ شاعری کا تعلق ہے اس میں فنی محاسن کے علاوہ مخاطب پر چوٹ کا گھاؤ بھی دیکھا جاتا ہے ، اس لڑائی کے طول پکڑنے کا امکان تھا اور اب تک جو کچھ ہوا وہ گھمسان کی لڑائی سے کم نہ تھا ، لیکن حسرت صاحب نے امروز کے بہرہ حرف و حکائت میں تاثیر کا نام لے کر بھرپور وار کیا ، انجمن حمائت اسلام کو متوجہ کیا کہ اس شخص کو اس نے اسلامیہ کالج کا پرنسپل بنا رکھا ہے سالک صاحب نے فوراً ہی مداخلت کر کے لڑائی رکوا دی ، اور اس طرح یہ معرکہ آن واحد میں ختم ہو گیا ، کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر تاثیر کا انتقال ہو گیا تو سوگواروں میں جو شخص سب سے پہلے ان کے ہاں پہنچا وہ حسرت تھے ، جب تک جنازہ نہیں اُٹھا ان کا چہرہ اشکبار رہا ، وہ قبر کو مٹی دیتے وقت بھی کف حسرت ملتے تھے ، کہ آخری عمر میں بد مزگی ہوگئی ، اُس بد مزگی کے پس منظر میں بھی میاں افتخار الدین تھے ، تاثیر مرحوم نے امروز میں اپنے قلمی نام (قدوسی نظامی) سے سیاسی نظمیں کہنی شروع کیں کہ ترقی پسندوں سے ان کا نظریاتی اختلاف ہو گیا ، تاثیر نے مجلس اُردو کی بنیاد رکھی ، میاں افتخار الدین نے کامریڈوں کے دباؤ پر " امروز " میں ان کی نظمیں رکوا دیں ، تاثیر نے " اخوان الصفا " کے نام سے چٹان میں ترقی پسندوں اور میاں افتخار الدین کی سیاسیات کو چھتاڑنا شروع کیا ، جن دنوں ترقی پسند کانفرنس ہوئی اور مخالفین نے اس کا تیا پانچا کیا تو یہ لڑائی ایک نیا رخ اختیار کر گئی ،

تاثیر نے روز نامہ مغربی پاکستان میں لکھا ۔۔۔۔۔۔

عجیب بات یہ جنتا کا یار کہتا ہے
کہ شعر وہ ہے جو فتو لہار کہتا ہے
کریں گے وہ جو نہ کوئی شریف کرتا ہو
کہیں گے وہ جو میاں افتخار کہتا ہے

حسرت صاحب نے مدۃ العمر کی دوستی کو طاق پر رکھا اور خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے ، اس پس منظر میں حسرت کو عمر بھر قلق رہا کہ میاں صاحب نے ان سے بے وفائی کی ، اور جن نوجوانوں پر تکیہ کیا تھا وہ طوطا چشم نکلے حسرت صاحب نے بھی ان نوجوانوں کو معاف نہ کیا ، ہمیشہ آڑے ہاتھوں لیا لیکن آمنا سامنا ہوتا تو کلیجہ سے لگا لیتے ، بعض نوجوان ان کی کمزوری تھے ،

"امروز" سے نکل کر کوشش کی کہ اپنا پرچہ نکالیں لیکن اب مالک و مدیر کا دور لد چکا تھا ۔ روپیہ پیسہ کا کھیل تھا ۔ اور ان کے پاس حسرت تعمیر کے سوا کچھ نہ تھا ۔ چار ماہ تک ہوائی قلعے بناتے رہے ۔ پھر کراچی چلے گئے وہاں ریڈیو میں معقول مشاہرہ ملنے لگا ۔ قومی پروگرام کے انچارج ہو گئے ۔ دوستوں نے مل جل کر کام نکالا تھا لیکن وہاں بھی ٹک نہ سکے ۔ ریڈیو کے کنٹرولر جنرل سید ذوالفقار علی بخاری سے ٹکرا گئے ۔ انہیں اپنی ذہانت و فطانت دونو پر ناز تھا ۔ حسرت ، پطرس مرحوم کی وجہ سے انہیں برخوردار سمجھتے تھے ۔ کسی نے پوچھا ذوالفقار کیسا شاعر ہے ؟ چمک کر بولے ، آپ سے سنا ہے کہ وہ شاعر بھی ہے ۔ قابلیت کا

سوال آیا تو فرمانے لگے ، میاں (سرکاری افسروں کی ذہانت لگی بندھی ہوتی ہے۔ ذوالفقار نے سالک صاحب سے گلہ کیا ، سالک صاحب نے ان سے پوچھا ، بولے

سالک (الف کو آہ ! کی طرح کھینچتے ہوئے) صاحب ذوالفقار تو مجھ سے یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اس کے سامنے اپنی تحریریں لے کر پیش ہوں ۔ اور اس سے مشورہ کروں ، یہ مجھ سے نہ ہو گا ۔ سالک صاحب نے ذوالفقار کو سمجھایا — بات آئی گئی ہو گئی ، لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا ۔ ایک دن مجھے خط ملا کہ

"آج صبح میں نے ریڈیو سے علیحدگی اختیار کر لی ہے ،

بھاری پتھر تھا اُٹھ نہ سکا ، چوم کے چھوڑ دیا"

اس اثنا میں امریکہ کے ایک طباعتی و اشاعتی ادارے سے معاہدہ ہو گیا ۔ گران قدر معاوضہ ، تاریخ کی کتابیں ، دن میں دو چار گھنٹہ ترجمہ کیا ، سو سوا سو کمایا ، شام کو وہی اللے تللے کراچی میں شراب پانی کی طرح بہتی ہے ، ہر چہ بادا باد ، عمدہ شراب ، نفیس کھانا ، حسن کے تخلیئے ، بالا خانوں پر مجرے ، انہی چیزوں کے لئے روپیہ کماتے اور انہی چیزوں پر گنوا دیتے تھے ۔ تھوڑا بہت پس انداز بھی کرتے لیکن زیادہ تر انہیں لٹانے ہی میں لطف آتا تھا ۔ کراچی میں انہوں نے شراب نہیں پی ۔ بلکہ شراب انہیں پیتی رہی ۔ مجید لاہوری بھی اسی قماش کے تھے ۔ دونو پی کر بد مست ہو جاتے ۔ لیکن مجید غٹا غٹ پی کر روتے اور حسرت

چوکڑی بھرتے تھے۔ اختر شیرانی اور عبدالحمید عدم کی طرح بازاروں میں گرنے پڑنے کے عادی نہ تھے۔ حسرت پر اچانک شراب نے حملہ کیا تو سالک صاحب نے اس خیال سے کہ شاید لاہور جا کر اعتدال پیدا ہو۔ انہیں لاہور چلے جانے کا مشورہ دیا اور وہ راضی ہو گئے۔ مجھے ایک خط میں لکھا کہ میں کراچی میں بیمار تو ہو سکتا ہوں لیکن مرنا نہیں چاہتا۔ مرنے کے لئے لاہور آ رہا ہوں۔ چنانچہ لاہور آ گئے۔ قلم کے کام تو ان کے لئے بہت سے تھے لیکن وہ سہل انگار ہو گئے تھے۔ کسی ضابطہ سے کام نہیں کرتے تھے۔ انہیں نوجوانوں میں بیٹھ کر گپیں ھانکنے میں جو لطف محسوس ہوتا تھا وہ قلم کے تخلیہ یا کتابوں کی خلوت میں نہیں۔

کسی زمانہ میں انہوں نے قدماء کے ادب کو اپنے حافظہ میں اُتار لیا تھا۔ اس طرح پڑھا جس طرح صحاح ستہ کے طلبہ حدیث پڑھتے ہیں۔ فسانۂ آزاد اور طلسم ہوشربا کی تمام جلدیں بچوں کی طرح پڑھیں اور ان کے الفاظ و معانی اور محاورہ و روزمرہ پر قادر ہوگئے۔ دلبر حسن مسحور انبالہ کے ایک نوجوان اسلامیہ کالج لاہور میں طالب علم تھے۔ وہ دن کو پڑھتے رات کو روزنامہ سیاست میں نیوز ایڈیٹری کرتے تھے۔ کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ اس زمانہ میں وہ گوالمنڈی تھانے کے اوپر کی منزل میں حسرت مرحوم کے ساتھ ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے۔ ان کی روائت تھی کہ حسرت ہر لحظہ مطالعہ میں جتے رہتے ہیں۔ ان دنوں فسانۂ آزاد، دوبارہ ان کے زیر مطالعہ تھا۔ وہ نئے نئے الفاظ اور نئے نئے محاوروں پر سرخ پنسل سے نشان لگاتے، لغت سے رجوع کرتے

اور نوٹ بک میں درج کر لیتے۔ برسوں ان کا یہی شعار رہا، تمام ادب چھان مارا، شاعری اور نثر دونو کے نباض ہو گئے۔ اس باب میں شاید ہی کوئی دوسرا آدمی ان کا حریف ہو۔ وہ الفاظ کی نسلوں تک سے آشنا تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ فلاں محاورہ کہاں سے آیا؟ فلاں روزمرہ کی اصلیت کیا ہے؟ اس ضرب المثل کی بنیاد کس نے رکھی؟ یہ کہاوت کیونکر بنی؟ فلاں ادیب کا سرمایہ الفاظ کتنا ہے؟ فلاں شاعر کے ہاں کل کتنے الفاظ ہیں؟ عروض میں یگانہ اسناد میں منفرد، انہیں چھیڑ کر ان سے بچنا محال تھا۔ وہ زچ ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔ سعادت حسن منٹو بھی ان کے ہم پیالہ تھے۔ وہ بھی شراب کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ ایک روز ان کے جی میں آئی کہ حسرت صاحب ہر ایک کو زچ کرتے ہیں۔ چلئے آج ہم انہیں زچ کریں۔ ان کے ہاں گئے۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ حسرت صاحب نے کسی مسئلہ پر دون کی لی کہ نوجوان ڈراتے زیادہ ہیں۔ آتا جاتا انہیں کچھ نہیں۔ منٹو نے پھریری لی۔

مولانا آپ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ خدا کی قسم اگر ایسا کوئی کیمیاوی عمل میرے ہاتھ لگ جائے جس کی مدد سے میں فسانۂ آزاد کے تمام روزمرے اور محاورے آپ کے دماغ سے نچوڑ لوں تو پتہ ہے کیا ہو؟ آپ ایک سیدھے سادے ھاتو بن کر رہ جائیں۔

مولانا بپھر گئے گرجتے ہوئے کہا برخوردار! اگر یہی

کیمیاوی عمل میرے ھاتھ لگ جائے جن کی مدد سے میں تمہارے اندر سے سرمرسٹ مائم کی سب کہانیوں کے چربے نکال لوں تو پتہ ہے کیا ھو؟ تم سیدھے علی گڑھ جا کر سیکنڈ ایر میں داخلہ لے لو - پوری محفل زعفران زار ہو گئی۔

اکثر نوجوانوں کی بد توفیقی کا ماتم کرتے اور ان کی فصد کھولتے تھے - ایک دفعہ غصہ میں آ کے کہنے لگے جی چاہتا ہے پنواڑی کی دوکان کھول لوں ؟

خیریت ہے مولانا ؟

بھائی ! (یہ الف بھی کشیدہ ہوتا) دیکھ نہیں رہے ہو - حجام آغا حشر ہو گئے - کبابی ظفر علی خان پر تنقید کرتے ہیں - ربابی ابوالکلام کے کان کترتے ہیں - کاتب غالب کی غلطلیاں نکال رہے ہیں - وہ ایک لونڈا عرب ہوٹل میں کیش میمو کاٹا کرتا تھا - آج کل تخلص لگا کر شاعر ہو گیا ہے - خطابت ان لوگوں کے ھاتھ میں ہے جنہیں صدر کا تلفظ معلوم نہیں - صحافت اناڑیوں نے اُچک لی ہے - کہاں جائیں ؟ انا للہ و انا الیہ راجعون

لاہور واپس آ کر دوبارہ کافی ھاؤس کو مستقل اڈہ بنا لیا ، سر شام چلے آتے اور اس کے بند ہونے تک محفل لگاتے ، کام کاج کوئی تھا نہیں ، جو پس انداز کر کے لائے تھے خرچ کرتے رہے ،

جو لوگ گرد و پیش جمع ہوتے ان میں زیادہ تر کاروباری لوگ تھے ، یا سیاسی — صحافتی یا ادبی آٹے میں نمک کے برابر ، البتہ مذاق سب کا ادبی تھا ، اور سیاسی بھی ، اکثریت ان لوگوں کی تھی جو محاورۃً پانچوں عیب شرعی تھے ، انہوں نے باہمی تحریک پر شبینہ محفلوں کی بنیاد رکھی ، ہر روز ایک دوست کے ہاں یا اس کے خرچ پر کسی خاص مکان میں شراب کا دور چلتا ، حسرت پیر مغاں ہوتے ، گئی رات تک پیتے پلاتے ، بکتے بنکارتے ، یہ معمول کوئی دو ماہ رہا ، نتیجہ یہ نکلا کہ حسرت صاحب ایک روز عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے ، میو ہسپتال میں دو ماہ رہے ، کرنل الہی بخش نے جانکاہی سے علاج کیا ، افاقہ ہو گیا ، گھر آ گئے تو سگریٹ اور شراب دونو سے توبہ تلا کر لی ، لیکن دل کا حملہ تھا ، کمزوری غالب آ گئی ، جن دانشوروں کے ساتھ شراب پیتے رہے وہ ہسپتال تک نہیں گئے تھے گھر میں کیا آتے ؟ البتہ شیخ غلام محمد ان کے ایک ایسے دوست تھے جو خود تھروم باسس اور ذیا بیطس کے مریض ہوکر بھی ان کی تیمارداری اپنا فرض سمجھتے تھے ، یا پھر وہ لوگ تھے جو ان کے روائیتی کوچہ ہی سے نا آشنا تھے ، مولانا عبدالمجید سالک ، حمید نظامی ، حامد محمود اور شورش کاشمیری ان کے ہاں تقریباً ہر روز ہو آتے ، میرے ساتھ اس دوستانہ علاقہ کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی ، اصل آغاز امروز سے انقطاع کے بعد ہوا لیکن چل چلاؤ کے آخری دو برسوں میں ان سے گویا عمر بھر کا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا ،

میرے نام ۳ مئی ۱۹۵۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں ،

'' آپ سے ملاقات ہوئے مدتیں ہو گئیں ، ممکن ہو تشریف لائیے ، دو گال ہنسئے بولئے ، اپنی کہئے ہماری سنیئے ، ''

۵ اپریل کے ایک خط میں مرقوم ہے ،

'' آپ مصروف ہیں ، آپ کی مصروفیتوں کی وجہ سے حمید علی والا معاملہ رہ گیا ہے پہلے خان عبدالغفار خان آ گئے تھے ، اب مولانا دریا آبادی تشریف لے آئے ہیں ، دو دن میں کوئی اور صاحب آ جائیں گے، میں آنے والوں میں نہیں ، جانے والوں میں ہوں ، گور کنارے بیٹھا ہوں ، سرکار کے پرمٹ کا انتظار ہے ، پرمٹ آ گیا تو لمحہ بھر فرصت نہ ملے گی ، اس لئے چاھتا ہوں کہ میرے جانے سے پہلے ان قصوں کا فیصلہ ہو جائے ، ذرا سوچئے تو سہی ،

بر آں صید لاغر چہ بیداد رفت

کہ در دام از یاد صیاد رفت

قصہ یہ تھا کہ ان کی ایک کتاب '' مردم دیدہ '' کے جملہ حقوق دارالاشاعت پنجاب کے پاس تھے دارالاشاعت شمس العلماء مولانا سید ممتاز علی کی یادگار تھا ، وفات کے بعد دونوں بیٹوں کو منتقل ہو گیا ، انہوں نے ترکہ تقسیم کیا تو دارالاشاعت اور مردم دیدہ

بھی بعض دوسری کتابوں کی طرح سید امتیاز علی تاج کے بڑے بھائی سید حمید علی کے حصہ میں آ گئے، حسرت کا بیان تھا کہ مردم دیدہ کو انہوں نے دو اڑھائی سو روپے میں فروخت کیا تب وہ عسرت میں تھے، ''مردم دیدہ'' کا مسودہ تیار تھا، اٹھا کر سید حمید علی کے حوالے کر دیا، وہ ایک یا دو ایڈیشن چھاپ کر فروخت کر چکے ہیں، اب مدت سے چھاپ نہیں رہے، کتاب نابید ہے، پندرہ سولہ برس گذر چکے ہیں، اگر سید صاحب اتنی یا دگنی رقم لے کر کتاب واپس کر دیں تو ان کی مہربانی ہو گی، اس غرض سے بات چیت کے لئے انہوں نے مجھے کئی دفعہ کہا تھا،

''مردم دیدہ'' میں سیرت نگاری کا ایک نیا اسلوب ہے، آقائے سوید اسلام خیال عظیم آبادی، آغا حشر کاشمیری، شفا الملک حکیم فقیر محمد چشتی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابو الکلام آزاد کل آٹھ شخصیتیں ہیں، لیکن لفظوں میں جان ڈال دی ہے، ہر شخص کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے ہم کسی شخصیت کے بارے میں پڑھ نہیں رہے بلکہ اس سے ہمکلام ہیں،

''مردم دیدہ'' میں حسرت کے طرز نگارش کی ساری خصوصیتیں جھلکتی ہیں، سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جس شخصیت کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے ان کی باریک بینی اور فطرت

شناسی ظاہر ہوتی ہے ، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے بڑے مطالب سمو دیے ہیں ، عیب بیان کئے ہیں تو غزل کے انداز میں ، حسن بیان کیا ہے تو قصیدہ نہیں لکھا ، مشاہدہ بیان کیا ہے اور اس میں بکمال و تمام سیرت آ گئی ہے ،

'' دو ڈاکٹر '' بھی سیرتوں ہی کا مطالعہ ہے ، ڈاکٹر محمد عالم اور ڈاکٹر ستیہ پال ۔ لیکن الفاظ کی رنگینی اور فقروں کی چستی کے باوجود اس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ انہیں قلم سے کچو کے دے رہے ہیں ، ان کی ساری کتابیں حتیٰ کہ مطائبات بھی عنقا ہو جائیں ، صرف ''مردم دیدہ'' رہ جائے تو ان کے صاحب طرز انشا پرداز ہونے کے ثبوت میں کتابی سائز کے ایک سو اٹھانوے صفحات کا یہ مجموعہ کافی ہے ، دوسری کتاب جو ان کے مطائبات کا صحیح عکس پیش کرتی اور ان کے قلم کی گلکاریوں کا رنگ باندھتی ہے وہ جدید جغرافیہ پنجاب ہے ، جس سے ایک خاص عہد کی صوبائی سیاسیات اور پنجاب کی سیاسی تحریکوں کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ ہوتا ہے ، جو باتیں اکبر الہ آبادی نے ذرا وسعت کے ساتھ قومی مسئلوں پر نپے تلے الفاظ اور شاعرانہ لہجہ میں کہی ہیں وہی اسلوب حسرت نے صوبائی سیاست کی بوقلمونی کا نقشہ کھینچنے کے لئے مقامی طور پر اختیار کیا ہے ، ایک ایسا شخص جو اس زمانے کے پنجاب کی سیاسیات کے طلوع و غروب سے ناواقف ہو اس جغرافیہ کا لطف ہی نہیں اٹھا سکتا ، ورنہ یہ ایک ایسا شہ پارہ ہے کہ اُردو مطائبات یا اردو طنزیات میں اس پائے کی تحریریں شاذ ہی لکھی

گئی ہیں ، اردو کے ادبی تنقید نگاروں نے اگر اس کتاب کا ذکر
نہیں کیا یا سرسری کیا ہے تو یہ ان کی معلومات کا افلاس ہے ، یا
ان کے دماغ کی دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ وہ ایک خاص دائرے
سے باہر جھانک ہی نہیں سکتے ، اس نزاع کا فیصلہ ابھی ذرا مشکل
ہے کہ ادب میں سیاسی گروہ بندی کتنی خطرناک ثابت ہوئی ہے ،
اور جن لوگوں کو یہ دعویٰ رہا ہے کہ انہوں نے عوامی ادب پیدا
کیا ہے وہ کہاں تک عوام دوست نکلے ؟ ان کے ادب میں عوام کے
لئے کیا تھا ؟ یا ان کے ادب نے عوام پر کیا اثر ڈالا ؟ لیکن
چراغ حسن حسرت جس قبیلے کے فرد تھے اس کے متعلق وثوق سے
کہا جا سکتا ہے کہ قلم کے اس خاندان نے اپنے دور میں بہت سوں
کو متاثر کیا ،

بعض نے تحریکیں پیدا کیں ۔ بعض خود تحریک ہو گئے ۔ اور بعض
نے تحریکوں میں جان ڈال دی ۔ حسرت کے طرز تحریر کی گیرائی سے
انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ ہر مضمون میں دلاویزی اور دلنشینی پیدا
کرتے ۔ لیکن جغرافیہ پنجاب یا مطائبات قسم کی تحریریں بڑی ہی
دلفریب تھیں ۔ عام لوگ اثباتی رائے قائم کرنے میں کوئی نہ کوئی
پہلو ضرور اخذ کرتے ۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے مطائبات کا اکثر
حصہ لکہ ہائے ابر کی طرح پھیل جاتا مطائبات جمع کئے جائیں
تو ہزاروں صفحات ہو جائیں ۔ لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں
کی ۔ جن اخبارات میں ان کا قلم جولانی دکھاتا رہا ۔ ان میں "احسان"
"امروز" اور "نوائے وقت" کے فائل محفوظ ہیں اور حرف و حکایت

کے نام سے ایک انتخاب انہی روزناموں سے اخذ کر کے شائع کیا گیا ہے لیکن یہ ان کی زندگی کے آخری دور کا مجموعہ ہے۔ جن اخباروں میں اس سے پہلے لکھتے رہے وہ اب دستیاب نہیں ہوتے۔ مطائبات کو پہلے پہل انہوں نے نئی دنیا (کلکتہ) میں کولمبس اور عصر جدید (کلکتہ) میں کوچہ گرد کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ مولانا ظفر علی خاں کلکتہ گئے تو انہیں لاہور لے آئے۔ زمیندار میں فکاہات لکھنے لگے۔ اکثر نام کے بغیر، کبھی حسرت کاشمیری یعنی اپنے نام سے، پھر سند باد جہازی ہو گئے - اور یہ قلمی نام مرتے دم تک اختیار کئے رکھا۔ جنگ میں بھرتی ہونے سے پہلے شیراز نکالا۔ امروز کے حرف و حکایت اور نوائے وقت کے مطائبات میں سند باد جہازی کے نام سے گلفشانی کرتے رہے۔ آخر کار قلم کی اس وادی میں یہی نام ان کی شہرت کا زیور ہو گیا۔ مطائبات میں واقعتاً قوس قزح کا رنگ ہوتا۔ وہ الفاظ کی مینا کاری اس چابکدستی سے کرتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی۔ بہ قول سالک ان کا اسلوب نگارش سادہ، سلیس اور دلنشین تھا، سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ مطائبات ہتک، ناگواری اور تیزی سے بالکل پاک ہوتے، لفظی ہیر پھیر اور تلازم و مناسبات کے اعتبار سے وہ اپنی بہت کم مثالیں رکھتے تھے۔ ان کے اس کالم میں ادبی محاسن اور لسانی خوبیوں کے علاوہ معلومات علمی و تاریخی بھی جا بجا پائی جاتی ہیں۔ جن سے ان کی وسعت مطالعہ اور حسن مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ قدماء کے ادب پر انہیں در خور وافی حاصل تھا۔ وہ کلاسیکل لٹریچر

کے رگ و ریشہ سے آشنا تھے۔ پنجاب کی ایک ریاست کے علاقہ پونچھ کا باشندہ ہو کر انہوں نے اردو زبان میں جو کمال حاصل کیا وہ بڑے بڑے اہل زبان کے لئے بھی قابل رشک تھا۔ ولی دکنی سے لے کر غالب تک اور غالب سے لے کر جالب تک کے کلام اور عہد بہ عہد کے نثر نگاروں کی تمام نزاکتوں سے واقف تھے۔ فارسی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ فارسی شعرأ کے دواوین کی چھان پھٹک کر چکے تھے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے تو معلوم ہوتا ترجمہ نہیں طبعزاد ہے۔ ٹکسالی میں ڈھل کے نکلا ہے۔ ادبیات کا مطالعہ وسیع و عمیق تھا۔ لیکن ان میں ایک عجیب عادت تھی!۔ کہ ہر شخص سے اس کے فن سے مختلف فن میں چھیڑ چھاڑ کرتے اور اس طرح اس کو پٹڑی سے اتار دیتے لیکن بعض لوگوں کا ادب بھی کرتے تھے۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر سے کسی فن یا موضوع پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ نظم کے شاعر سے غزل کے موضوع پر اور غزل کے شاعر سے نظم کے عنوان پر بحث کرتے۔ افسانہ نویس سے تاریخ پر، ادیبوں سے سیاسیات پر، سیاسئین سے ادب پر! اردو کے اہل قلم سے انگریزی ادب پر اورجو لوگ صرف فارسی جانتے ہوتے ان سے عربی زبان کی جامیعت پر گفتگو کرتے تھے اور اگر کسی عربی دان سے واسطہ پڑتا تو فارسی کی خوبیوں پر چہچہانے لگتے۔ کسی کو زچ کرنا ہوتا تو اس کی استعداد کا اندازہ کر کے اس سے اونچے درجے کی باتیں کرتے۔ ایک دفعہ ریاضی کے ایک مشہور پروفیسر سے جغرافیہ کی کتھا لے بیٹھے۔ جغرافیہ کا ایک پروفیسر ہتھے چڑھ

گیا تو الجبرا کا راگ چھیڑ دیا - ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے مطائبات
کا حصہ ہو لیکن اس طرح وہ مخاطب و سامع دونو کو مرعوب
کرتے تھے - اس لحاظ سے وہ ایک صحیح صحافی تھے - کہ ان کا
دماغ علوم و فنون کے اکثر گوشوں کا شناسا تھا - وہ ہر مضمون کے
بارے میں بنیادی معلومات رکھتے تھے - لیکن ان کی شخصیت
مطائبات ہی میں ابھرتی تھی - ایک ادیب طناز کے طور پر اس میدان
میں کھیوں نے نام پیدا کیا - جہاں تک زبان اور اس کی نزاکتوں
کا تعلق ہے وہ دہلوی اور لکھنوی حضرات کو بھی پٹھے پر ھاتھ
دھرنے نہیں دیتے تھے - بلکہ اس بارے میں بڑے ہی سرکش تھے -
جس چیز کو زبان کہتے ہیں اور زبان بھی وہ جو شرفا کے ہاں بولی
جاتی ہے یا کبھی جس کو قلعہ معلی یا مٹیا محل کی زبان کہتے تھے
اور جو امرأ دربار بولتے تھے حسرت اس کے رسیا تھے - خواجہ حسن
نظامی نے ایک دفعہ زمیندار کی با محاورہ اردو اور روزمرہ کی لطافت
کا ذکر کرتے ہوئے ان کے فکاہات مولانا ظفر علی خاں کے نام سے
نقل کر دیئے تھے -

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ مختلف ادبی و شعری تذکروں کی
بر جستہ گوئیاں ان کے قلم کی نوک پر رہتی تھیں اور انہیں سیاسی
واقعات کی رعائت سے چسپاں کرتے تھے - بسا اوقات بڑے بڑے
جھگڑوں کو ہلکے پھلکے تبسم میں ٹال دیتے - ایک زمانہ میں بریلوی
اور دیو بندی علماء میں مناقشہ چھڑ گیا - حسرت راسخ العقیدہ مسلمان
تھے - ذہن **ان** کا دیو بند کی طرف تھا - مولانا دیدار علی شاہ نے

مولانا ظفر علی خاں کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ مولانا وہابی ہو گئے ہیں۔ حسرت زمیندار کے ادارۂ تحریر میں تھے۔ مولانا دیدار علی شاہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس پہلو سے مطائبات لکھتے رہے کہ بریلوی حضرات کو جان بچانی مشکل ہو گئی۔ انہی دنوں ایک لطیفہ لکھا جو مولانا ظفر علی خاں کے ''کفر'' اور مولانا دیدار علی شاہ کے اسلام پر ایک بھر پور طنز تھا، لطیفہ تھا۔

" مولانا ظفر علی خاں خود تو ہمیشہ نماز کے پابند رہے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ میں انہیں اس بات کا بڑا خیال تھا کہ لاہور کے تمام مسلمان ان کی طرح نماز کے پابند ہو جائیں۔ کسی نے مولانا کے ایک پرانے خدمتگار سے پوچھا، تمہیں معلوم ہے کہ مولانا ان دنوں صبح کی نماز پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟ یہ سن کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا۔

صاحب! میں یہ باتیں کیا جانوں لیکن اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ مولوی صاحب وہابی ہو گئے ہیں۔

ان کے مزاح کا گھاؤ بے ضرر تھا، چٹکی ضرور لیتے تھے، لیکن اس طرح کہ ہدف کو تکلیف نہ ہو بلکہ وہ خوش ہو کہ ادب کی بات ہوئی ہے، مثلاً تقسیم ملک کے بعد احرار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

آپ نے زمانہ قبل از تاریخ کا جغرافیہ پڑھا ہے تو آپ کو یاد

ہوگا، ان دنوں اس سر زمین میں احرار کے خانہ بدوش آباد تھے، جو
چارہ اور پانی کی تلاش میں پھرتے رہتے، یہ لوگ کبھی مسلم لیگ
کے کوہستانوں اور کاہستانوں میں گلے چراتے پھرتے تھے، کبھی کانگریسی
سلسلہ کوہ کے زرخیز دامن میں ڈیرے ڈال دیتے تھے، لیکن ان
قبائل پر قریب قریب وہی ماجرا گذرا ہے جو امریکہ اور آسٹریلیا کے
قدیم باشندوں پر گذر چکا ہے، یعنی ان کی تعداد کم ہو گئی ہے،
ان کے گلے بہت چھوٹے چھوٹے رہ گئے ہیں، نہ وہ دودھیل گائیں
ہیں، نہ وہ موٹے تازے مینڈھے اور بکریاں، ان کی سمجھ میں نہیں
آتا کہ چارہ اور پانی کی تلاش میں کس طرف کا رخ کریں؟
مشرق میں بحر و انگاہ یعنی وا گہ سا گر راستہ روکے کھڑا ہے مغرب
کی جانب کچھ اور خانہ بدوش قبیلوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں،۔!

مسٹر آصف علی نے مس ارونا گنگولی سے شادی کی تو
اخباروں میں اس کا بہت چرچا ہوا، حسرت نے لکھا کہ افسوس
آصف علی کشمیر میں نہ ہوئے،

کسی نے پوچھا، تب کیا ہوتا؟

کہنے لگے، مس گنگولی کی نسبت سے لوگ ان کا نام گونگلو
رکھ دیتے اور صدیوں تک اس نام سے ان کے پورے خاندان کا
پیچھا نہ چھوٹتا،

غرض حسرت منہ آئی بات کہنے سے رکتے نہیں تھے، حاضر جوابی

اور برجستہ گوئی ان کے ہاتھ کی چھڑی تھی ، جن دنوں مرض الموت میں مبتلا تھے ان دنوں بھی ان کی باغ و بہار طبیعت کا یہی حال تھا ، کسی نے کہا ،

مولانا ، کافی ہاؤس والے دودھ میں پانی ملاتے ہیں ،

کہنے لگے ،

نہیں بھائی ، وہ دودھ میں پانی نہیں ملاتے بلکہ پانی میں دودھ ملاتے ہیں ۔ لڑکے سے کہا ، کافی لاؤ ،

وہ بھول گیا ، یا دیر ہو گئی ، مالک سے بلا کر شکایت کی کہ گھنٹہ ہو گیا ہے ابھی تک کافی نہیں آئی ، مالک نے پوچھا آپ نے کس کو آرڈر دیا تھا کہنے لگے ان لڑکوں ہی میں سے کوئی تھا ؟ ۔

کون تھا ؟ ۔

بھئی یہی لوگ جو آپ نے لگا رکھے ہیں ؟

" فلاں لڑکا تو نہیں تھا ؟ " مالک نے پوچھا ،

بھئی جس وقت آرڈر دیا تھا اس وقت تو لڑکا یہی تھا اب جوان ہو گیا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا ،—؟

مقدمہ سازش راولپنڈی میں فیض احمد فیض کی گرفتاری کے

دوسرے یا تیسرے روز سید اعجاز حسین شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس دفتر چٹان میں تشریف لائے وہ تقریباً سبھی جرنلسٹوں، سیاسی راہنماؤں اور دینی پیشواؤں کے یار باش تھے، مدۃ العمر عرب ہوٹل کے ساتھ کی گلی میں رہے۔ اسی زمانہ میں حسرت صاحب سے ان کی دوستی ہوئی اور مرتے دم تک رہی، شاہ صاحب نے دفتر چٹان سے امروز میں فون کیا اور صرف مزہ لینے کے لئے حسرت صاحب سے کہنے لگے،

حسرت صاحب ہیں ؟

جی ہاں ، میں بول رہا ہوں ،

" میں اعجاز حسین شاہ ڈی ایس پی بول رہا ہوں "

" کہئے شاہ صاحب مزاج اچھے ہیں " ؟

" اللہ کا شکر ہے "

" فرمایئے " ؟

" آپ ذرا تشریف لائیں ، فیض صاحب کے بارے میں آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں ،

" مجھ سے " ؟

" جی ہاں "

" مجھ سے کیا تعلق ہے ؟ "

" اس سازش میں آپ کا نام بھی آ رہا ہے "

" لا حول ولا قوۃ "

" بس آ جائیے سپرنٹنڈنٹ صاحب یاد کر رہے ہیں "

" شاہ صاحب غضب کرتے ہیں آپ ؟ کہاں آ جاؤں " ؟
" شاہی قلعہ میں " ؟
" انا للہ و انا الیہ راجعون" (سانس پھول گیا)
" شاہ صاحب ! وہ بھی کوئی شرفا کے آنے کی جگہ ہے " ؟

شاہ صاحب مسکرا اُٹھے ، " اچھا تو میں آ رہا ہوں "

" تشریف لائیے ، مہربانی ہو گی ، "
" کہاں ہے آپ کا مکان ؟ "
" قلعہ گوجر سنگھ کے چوک سے دو راستے نکلتے ہیں ، ایک نکلسن روڈ کو دوسرا میکلوڈ روڈ سے زمیندار کے دفتر کو جاتا ہے ، اُدھر ڈاکٹر ریاض علی شاہ کے مکان سے ذرا ہٹ کر ، سامنے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی کوٹھی ہے اُس کے پہلو میں راشن بندی کا دفتر ہے ،
" جی ہاں " ؟
" تو شاہ صاحب وہاں چلے آیئے ، یہ بندہ اُس بندی کے اُوپر رہتا ہے ،

وہ نثر کی ہر صنف پر قادر تھے ، سیرت بھی لکھی ، افسانے بھی تحریر کئیے ، تاریخ پر بھی قلم اٹھایا ، بچوں کا نصاب بھی لکھا ، عروض میں بہرۂ وافر رکھتے تھے ، شاعری کے ہر کوچہ سے آشنا رہے لیکن اپنے آپ کو شاعری کے حوالے نہیں کیا ، کبھی کبھار شعر کہہ کر جی بہلا لیتے تھے ، غزل ہو یا نظم ، طنز کریں یا پیروڈی ، نعت لکھیں

یا منقبت قلم ان کا موتی ہی بکھیرتا تھا، ان کا شاعرانہ کلام بہت مختصر ہے، لیکن جو لکھا ہے ناپ تول کر لکھا ہے، اور دل میں ترازو ہو جاتا ہے، زمیندار اور انصاف کے زمانہ میں سیاسی نظمیں بھی کہی تھیں، لیکن اب نا پید ہیں، غزل ان کی رسیلی ہوتی، چند غزلیں ہیں کسی مجموعے کی شکل میں نہیں، اشعار کا ایک انتخاب ہے یا پھر دوستوں کو بعض غزلیں اور ان کے شگفتہ اشعار از بر ہیں، جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں، غزل کہنے کے لئے عموماً اساتذہ کی زمین تلاش کرتے اور تیر و نشتر نکالتے تھے مثلاً ------

ترا آستاں جو نہ مل سکا تری رہگذر پہ جبیں سہی
ہمیں سجدہ کرنے سے کام ہے جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

غم آرزو کو نہ تازہ کر دل بے خبر یہ وہ آگ ہے
جو سلگ اُٹھی تو سلگ اُٹھی جو دبی رہی تو دبی رہی

ہونٹوں پہ سرد آہیں منہ پر ہوائیاں ہیں
حسرت کہو کہ کس سے آنکھیں لڑائیاں ہیں
شاخ سمن میں گویا لالہ کھلا ہوا ہے
گلرنگ چوڑیاں ہیں گوری کلائیاں ہیں
قسمت کی کیا شکائت تقدیر کا گلہ کیا ؟
جتنی برائیاں ہیں دل کی برائیاں ہیں

حسن کو خود بین و خود آرا کیا
اے نیاز عاشقی یہ کیا کیا

اُمید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا ۔ ۔ ۔ !
غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا
اک عشق کا غم آفت اور اُس پہ یہ دل آفت
یا دل نہ دیا ہوتا یا غم نہ دیا ہوتا
ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

پھر وہی میں وہی نظر اُن کی
دیدہ و دل کی یاریاں نہ گئیں

زندگی تو ہی مختصر ہو جا
شب غم مختصر نہیں ہوتی

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑئے رات گئی بات گئی

قبول اس بارگہ میں التجا کوئی نہیں ہوتی
الٰہی ، یا مجھی کو التجا کرنا نہیں آتا

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوق سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے
جوانی مٹ گئی لیکن خلش درد محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے
اُمید وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست
اے غم یار تیری عمر دراز - -

ماھیا پنجابی زبان کا دو سخنہ ہے ، جس میں شاعر کسی خارجی کیفیت کا حوالہ دے کر داخلی کیفیت بیان کرتا ہے ، حسرت نے اُردو میں بہ تصرف اس صنف کو منتقل کیا ہے ،

ماہیئے ملاحظہ ہوں -
باغوں میں پڑے جھولے -
تم بھول گئے ہم کو ہم تم کو نہیں بھولے

ساون کا مہینہ ہے۔
ساجن سے جدا رہ کر جینا کوئی جینا ہے

آخر یہی ہونا تھا۔
تم کو یونہی ہنسنا تھا ہم کو یونہی رونا تھا

مطائبات میں بھی شاعری کرتے تھے اور اس طنز کا جواب نہیں ہوتا تھا۔ یونی نسٹ پارٹی کی شان میں چند ٹپے لکھے جو اس زمانہ میں لوگوں کی زبان پر رواں رہے۔

تیرے گورے گورے گال ——— اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال ——— اتحاد پارٹی
تیرا یار نرنیدر ناتھ ——— اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ ——— اتحاد پارٹی

میاں ممتاز دولتانہ اور میاں عبد الباری یکے بعد دیگرے صوبہ مسلم لیگ کے صدر ہوئے تو ایک گیت لکھا ٹیپ کا بند تھا۔

چنا جور گرم
میرا چنا ہے سب سے نیارا - جس کو کھائے عالم سارا
منشی، متعدی، پٹواری - جما، فتا، عبدالباری
چنا جور گرم

میرے چنے کا ڈھنگ نرالا - اس کو کھائے قسمت والا
اس کے گاہگ طرے والے - یعنی ھپ ھپ ہرے والے
سارے مہاجر اور انصاری - چیمہ لڈن عبد الباری
چنا جور گرم

اسی طرح جنگ نامہ وزارت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے الفاظ کے اس انبار میں کار زار کا نقشہ کھنچا ہوا ہے -

بدہ ساقی آن مے کہ تا دم زنیم - قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
مجھے بادۂ مشکبو کر الاٹ - مئے ارغواں کا سبو کر الاٹ
پلا ساقیا آب آتش لباس - کہ ملائے مسجد کے گم ہیں حواس
عسس سے نہ ڈر محتسب سے نہ ڈر - ہیں دونو پڑے مست اور بے خبر
ہیں مفتی و شیخ اور میر و وزیر - کمند ہواؤ ہوس کے اسیر
ہے واعظ امارت کے خوابوں میں گم - تمول کے زریں نقابوں میں گم
فقیہوں کو ہے کارخانوں کی فکر - دوکانوں کی فکر اور مکانوں کی فکر
پلا ساقیا آب یا قوت رنگ - کہ ارباب دولت ہیں مصروف جنگ
حجابات مستی اٹھا کر پلا - نگاہوں کی مستی ملا کر پلا
ادھر اہل مسجد اُدھر اہل دیر - سبھی دیکھتے ہیں لڑائی کی سیر
سبک باش و رطل گرانم بدہ - اگر فاش نتوان بہانم بدہ
ہوس نے ہے چھیڑا تباہی کا راگ - گرجتی ہیں توپیں برستی ہے آگ
ادھر دولتانہ شہ جم سپاہ - سپہدار گردان زریں کلاہ
لئے ساتھ حیلوں بہانوں کی فوج - وہ وعدوں کے لشکر فسانوں کی فوج

غرور شہی سے نظر تا بناک ۔ مگر دامن آگہی چاک چاک
وہ فیروز خاں نون مرد جری ۔ نگاہوں میں ہے جس کی افسوں گری
جسے یاد ہیں سب لڑائی کے ڈھنگ ۔ لڑائی کے جنگ آزمائی کے ڈھنگ
کرامت علی گرد لشکر شکن ۔ جسے مانتے ہیں سب ارباب فن
سیال اور چٹھے بسال اور کھرل ۔ چلے رزم گہہ کی طرف دل کے دل
لئے پلٹنیں اور رسالے چلے ۔ کئی ساتھ اخبار والے چلے
چلے اور پرچم اُڑاتے چلے ۔ ستاروں سے آنکھیں لڑاتے چلے
کوئی ان میں لندہور کی یاد گار ۔ کوئی رستم اور کوئی اسفند یار
کوئی ان میں پوتا ہے کاؤس کا ۔ بھتیجا سگا ہے کوئی طوس کا
ادھر خان ممدوٹ مرد دلیر ۔ وزارت کے بیشے کا غرندہ شیر
شجاعت میں یکتا شہامت میں فرد ۔ بڑھا جانب عرصہ گاہ نبرد
چلا ساتھ اس کے وہ گرگ کہن ۔ یل نام آور محمد حسن
لئے ساتھ ملتان کے گھڑ چڑھے ۔ مبارک علی اور دستی بڑھے
کسی سمت ہے پاندانوں کی فوج ۔ کسی سمت رنگیں بیانوں کی فوج
چلیں حرص کی پلٹنیں پیش و پس ۔ ادھر بھی ہوس اور اُدھر بھی ہوس
ہے کاندھے پہ ہر چند گرز گراں ۔ دعاؤں میں مصروف لیکن زباں
جو مل جائے یا رب کوئی فیکٹری ۔ مری بھی ہو کشت تمنا ہری
وزارت ملے یا صدارت ملے ۔ کوئی مال بھر تجارت ملے
الٰہی مجھے بھی سکتر بنا ۔ کریما بہ بخشائے بر حال ما
ہوا گرم ہنگامۂ کار زار ۔ نظر آئی دشوار راہ فرار
وہ گالی کے چھرے وہ طعنوں کے تیر ۔ گئے آن کی آن میں دل کو چیر

کمند اژدھائے مسلسل شکنج - دہن باد کردہ بہ تاراج گنج
بڑا لطف اس ھاتھا پائی میں تھا - مزا کرسیوں کی لڑائی میں تھا
لڑی بڑھ کے جاگیر جاگیر سے - لیا کام نیزے کا تدبیر سے
ادھر خوب کرسی سے کرسی لڑی - مری سمت سے کس مپرسی لڑی
بڑھے دونوں جانب سے آتش بیاں - بیانوں کی توپوں نے باندھا سماں
بہت خوب اخبار والے لڑے - مقالے سے بڑھ کر مقالے لڑے
نہ پانی گھڑے میں نہ چولھے میں آگ - مگر خوب کھیلے لنگوٹی میں پھاگ

پلا ساقیا بادۂ لعل فام - لنڈھا دے سے ارغوانی کے جام
مئے احمریں سے کھلا دے چمن - بیاد شہیدان خونیں کفن
ہوا ختم جاگیر داری کا دور - ٹوانے کا دور اور لغاری کا دور
اُٹھ اوران سے تیغ و سناں چھین لے - یہ ووٹوں کے گرز گراں چھین لے

مرا دور ہے اور ترا دور ہے
زمین اور ہے آسماں اور ہے

ہمارے سامنے جن اہل قلم کو شراب نے ذبح کیا ان میں حسرت بھی تھے ، اختر شیرانی اور مجید لاہوری بھی اسی کے ھاتھوں مارے گئے ، ان ہر سہ میں ایک خوبی عجیب و غریب تھی کہ شراب پی کر دھت ہو جاتے لیکن دین کے معاملہ میں ذرہ بھر گستاخی یا اھانت برداشت نہ کرتے ، حسرت شراب پی کر بھی با حواس ہی رہتے مگر اختر اور مجید حواس بھی کھو بیٹھتے تھے ، دین سے ان کے

لگاؤ کا یہ حال تھا کہ جب کوئی مسخرہ ان کے نشہ سے فائدہ اٹھا کر مذہب پر نکتہ چینی کی جسارت کرتا تو اس کو سختی سے روک اور ٹوک دیتے تھے ،

ایک روز بعض نوجوانوں نے کافی ھاؤس میں مذہب پر تنقید شروع کی اثنائے گفتگو میں انہوں نے اسلام کو نشانۂ استہزا بنانا چاہا ، حسرت صاحب کو فوراً ہی تاؤ آ گیا ،

کہنے لگے میاں ! منہ کو لگام دو تم شائد اس لئے یہ تمسخر کر رہے ہو کہ تمہیں یہ نعمت غیر مترقبہ باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہے ، تمہیں قدر نہیں ؟ میں نے اپنے باپ دادا اور بہن بھائی کی قربانی دے کر اسلام حاصل کیا ہے مجھے اس نعمت کی عظمت کا احساس ہے - حسرت صاحب کے والد یا دادا مسلمان ہوئے تھے انہیں اپنے جدی رشتوں کے بچھڑ جانے کا احساس بھی تھا ، لیکن وہ اسلام کے لئے ان سب کو قربان کر چکے تھے ،

موت و حیات اللہ کے اختیار میں ہے لیکن شراب نے انہیں قبل از وقت موت کے حوالے کر دیا ، وہ ڈیڑھ برس قلب کے عارضہ کا شکار رہے ، کئی دفعہ ہسپتال میں داخلہ لیا ، گھر میں علاج کراتے رہے ، مگر ان کی صحت کو دو چیزیں کھا گئیں ، اولاً روز مرہ کی شراب ، ثانیاً بڑے بیٹے ظہیر کی فکر ، ظہیر کا ایک غم تو یہ تھا کہ اس میں لڑکپن کی شوخیاں رچ بس گئی تھیں ، دوسرا پیر سعید نے ظہیر کو اغوا کیا تو باز یابی تک سوکھ کے کانٹا ہو

گئے ، ان دو ” حادثوں “ نے ان کی صحت کو ہلا ڈالا ، شوکت تھانوی کے الفاظ میں جو شخص کبھی دو منزلہ عمارت نظر آتا تھا اب ایک کھنڈر نظر آ رہا تھا ، سوائے لمبائی کے ان کے جسم میں اور کچھ باقی نہ رہا تھا ، گھنی مونچھیں باقی رہ گئی تھیں لیکن لمبائی جھکتی جا رہی تھی ، صاف محسوس ہو رہا تھا کہ پا بہ رکاب ہیں ،

ایک روز حاضر ہوا تو معلوم ہوا حواس خمسہ کی ایک تہمت سی باقی ہے فرمایا ، میری حالت اس بستی کی ہے جس پر قہر خداوندی نازل ہوتا ہے ، تو اس بستی کی کسی مسجد کی دعا بھی نہیں سنی جاتی ہے ،

پھر فرمایا ، انیس کا وہ شعر یاد ہے - - - - -

اعضائے بدن سب چور ہوئے اک دل کے شہادت پانے سے
فوجوں میں تلاطم برپا ہے سالار کے مارے جانے سے

اس سے اگلے روز ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو سہ پہر کے لگ بھگ داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی - - - - - یہ شمع ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ، - - - - ع

شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

مہاشہ کرشن

لاہور میں ہندوستان کی تقسیم سے پہلے ہندوؤں کے اُردو روزناموں کا زور بندھا ہوا تھا۔ پنجاب، سرحد بلکہ کراچی تک ٹربیون واحد انگریزی روزنامہ تھا جو لاہور سے نکلتا اور ہندوؤں کی ملکیت تھا۔ یہ اردو تذکرہ نویسوں کا سیاسی تعصب ہے کہ وہ ان روزناموں سے صرف نظر کرتے یا محض سرسری ذکر اذکار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان روزناموں نے ملکی خبروں کا مزاج پیدا کیا۔ سہل نویسی کی بنیاد رکھی۔ اور اداریوں کو سیاسی مذاق و میلان تک محدود رکھا اس میں شک نہیں کہ ان اخباروں کی بدولت فرقہ واریت کو راستہ ملا اور ہندو تعصبات قوی سے قوی ہوتے گئے نتیجۃً مسلمانوں کو علیحدہ

ذہن سے سوچنا پڑا - اور وہ متحدہ قومیت کے تصور سے بیزار ہوکر اپنے مؤقف میں پختہ ہو گئے - لیکن جہاں تک ان اخبارات کی معنوی خصوصیت کا تعلق ہے ان میں اردو زبان کی شیرینی و رنگینی نہ سہی، لیکن بہر حال یہ اخبار ضرور تھے مسلمانوں کے روزنامے مقابلةً ادبی زیادہ تھے - لباس ان کا اسلامی تھا - ہندو روزناموں کی روح سماجی یا سناتنی تھی لیکن مزاج سیاسی تھا - مسلمانوں کے معاملہ میں بالطبع تنگ نظر تھے - مسلمان راہنماؤں کے متعلق ان کا رویہ اور رجحان متعصبانہ تھا - ان کے متعلق بے سروپا خبریں اڑاتے لیکن من حیث المجموع خبروں کے بارے میں مسلمان روزناموں سے بہت آگے تھے - رہا ادارت کا سوال تو وہ مختلف قومی و ملکی مسائل پر سیاسی تبصرہ کرنے میں مسلمان معاصروں سے آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں تھے - ان کے اداریے مختصر واضح اور سہل ہوتے - پہلے ان روزناموں کا سائز، موجودہ ہفتہ وار جرائد کے مطابق تھا - پھر مسلمان اخباروں کی طرح بڑا سائز ہو گیا - ضخامت مسلمان اخباروں کے مقابلہ میں ہمیشہ زیادہ رہی - لطف کی بات یہ ہے کہ ان اخباروں کے خریدار مسلمان بھی تھے - جس تعداد میں مسلمان اخبار چھپتے بلا شبہ اتنے ہی مسلمان ان اخباروں کے گاہک تھے - ان کا اصول یہ تھا کہ ایک اخبار اپنے قاری کو ملکی و قومی مسئلوں میں کہاں تک معلومات مہیا کر سکتا اور پیش آمدہ واقعات میں راہنما ہو سکتا ہے -

ان اخبارات نے پنجاب میں اردو کو بڑا سہارا دیا - پھر جب ہندی کی تحریک چل نکلی تو یہ اخبار ہندی کی حمایت اور اردو کی

مخالفت ، اردو ہی میں کرتے رہے لیکن اجتماعاً ان کا رنگ و روغن وہی رہا جس کے باعث یہ اردو کے لسانی مزاج سے اختلاف کرتے تھے ۔ پاکستان میں اس وقت جو روزنامے بڑی سج دھج سے نکل رہے ہیں طباعت کی سہولتوں سے قطع نظر ، ان کی ہیئت ہندوؤں کے ان روزناموں سے مختلف نہیں بلکہ ان کی ایک خوبصورت نقل ہیں ، اُن روزناموں کا کام سیاسی فہم و ذکا کی وسعت کے ساتھ گاہک پیدا کرنا تھا ۔ ان روزناموں کا نصب العین سیاسیات سے دستبردار ہو کر اشاعت بڑھانا ہو گیا ہے ۔

کہنے کو تو لاہور میں ہندوؤں کے بہت سے روزنامے اور بے شمار ہفتہ وار اخبار تھے لیکن جن اخباروں نے بہت زیادہ نام پیدا کیا اور جن کے ایڈیٹروں کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا ان میں پرتاپ اور اس کے مالک و مدیر مہاشہ کرشن ، ملاپ اور اس کے مالک و مدیر لالہ خوشحال چند خورسند ، سر فہرست تھے ۔ ان دونوں کے علاوہ بھی ہندوؤں کے دو اخبار وقیع سمجھے جاتے تھے ۔ ایک لالہ لاجپت رائے کا بندے ماترم ، لالہ جی خود تو پنجاب بلکہ ہندوستان کے بہت بڑے سماجی اور سیاسی لیڈر تھے لیکن بندے ماترم کو پرتاپ یا ملاپ کا مقام حاصل نہ ہو سکا ۔ دوسرا اخبار ویر بھارت تھا ۔ جس کے ایڈیٹر اردو کے نغز گو شاعر میلا رام وفا تھے ۔ وہ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان لکھتے ۔ ان کے اشعار میں کوئی فنی عیب نہ ہوتا ۔ معلوم ہوتا ہر شعر سانچہ میں ڈھل کر نکلا ہے ۔ مگر وہ بھی مہاشہ کرشن یا مہاشہ خورسند کو نہ پہنچ سکے ۔

ویر بھارت سناتنیوں کا اخبار تھا۔ ہندوؤں میں سناتنی پچانوے فی صد تھے۔ لیکن اخبارات کی قیادت پرتاپ اور ملاپ ہی کے ھاتھ میں رہی۔ یہ دونوں بلکہ بندے ماترم بھی آریہ سماجیوں کی ملکیت تھے۔ اور ہر لحاظ سے ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔ ان چار کے علاوہ آخری دنوں میں پربھات نکلا۔ جو پرتاپ کے ایڈیٹر لالہ نانک چند ناز کی ادارت میں تھا۔ بندے ماترم بند ہو کر ایک نوجوان کے ھاتھ میں چلا گیا۔ اور تقسیم ملک سے پہلے دوبارہ اُڑنا چاھا لیکن حالات کی نذر ہو گیا۔ سکھوں نے اجیت نکالا۔ مگر بیل منڈھے نہ چڑھی۔ مہاشہ کرشن کے بڑے لڑکے ویریندر نے جے ہند جاری کیا۔ لیکن طوطی پرتاپ اور ملاپ ہی کا بولتا رہا۔ دونو ذہنی اعتبار سے برابر کی ٹکر تھے یا نہیں۔ لیکن مہاشہ کرشن بہر حال اپنی اصابت فکر کے باعث پنجاب میں ہندو ایڈیٹروں کے سرخیل سمجھے جاتے تھے۔ ان کی رائے کو مقابلۃً ترجیح دی جاتی اور اس کا وزن محسوس کیا جاتا۔ پرتاپ اور ملاپ دونوں میں آخر وقت تک مسابقت کا زور بندھا رہا۔ اب تقسیم کے بعد بھی دونو ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ لیکن مسلمان اخباروں کی طرح ان میں اس انداز کی تو تکار کبھی نہ ہوئی جس طرز کی لڑائیاں سیاست نے چھیڑ رکھی تھیں۔ یا زمیندار اور انقلاب میں یدھ ہوتا رہا۔ وہ ذاتیات کو سیاسیات سے بہر حال الگ رکھتے تھے۔

مہاشہ کرشن اور لالہ خوشحال چند دونو آریہ سماجی اور سوامی دیا نند کے پیرو تھے۔ لیکن دونو کا تعلق سماج کے دو مختلف

دھڑوں سے تھا - مہاشہ کرشن گوروکل کے دھڑے میں تھے -
لالہ خوشحال چند نے کالج کے دھڑے کی اعانت سے اخبار نکالا تھا -
مہاشہ کرشن نے پرتاپ جاری کیا تو اس وقت ہندوؤں کا ایک بھی
سیاسی روزنامہ نہ تھا - سر مائیکل اوڈ وائیر پنجاب میں گورنر تھا -
اس کو سیاسی تحریکوں سے للہی بغض تھا - مولانا ظفر علی خاں کو
حیدر آباد سے اسی کے ایماءٔ پر نکلنا پڑا تھا - حضرو کی ایک تقریر پر
مولانا کو پانچ سال بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی تو یہ خبر سب
سے پہلے پرتاپ نے شائع کی - اس پر اوڈ وائیر بگڑا - پرتاپ بند
ہو گیا - مہاشہ جی پر مقدمہ چلا - مہاشہ جی ڈیڑھ برس قید ہوگئے -
سزائے قید پوری ہوئی تو پرتاپ پھر جاری ہوا - ہندوؤں میں وطنیت
کا جذبہ ابھر کے راسخ ہو چکا تھا - عام تجارت اور صنعت بھی ان کے
ہاتھ میں تھی - دیکھتی آنکھوں پرتاپ کہیں سے کہیں نکل گیا -

مہاشہ کرشن کو نزدیک سے دیکھنا مشکل تھا - لیکن وہ
ڈھکے چھپے بھی نہیں تھے - ایڈیٹر تھے - لیڈر نہیں - یہی وجہ تھی
کہ وہ عوام کی باتیں تو کرتے تھے لیکن عوام سے نکل کر خواص
میں چلے گئے تھے - ذاتی دوست تو ہر شخص کے ہوتے ہیں اور ان
سے بے تکلفی بھی رہتی ہے یا پھر بعض گرد و پیش کے لوگ مثلاً
ملازم وغیرہ بھی عادتوں سے آشنا ہو جاتے ہیں مگر ایک کھلی کتاب
کی طرح عوام کی نگاہ میں رہنا مہاشہ جی کے لئے ممکن نہ تھا - وہ
طبعاً خاموش کم گو اور کم آمیز تھے - اکثر لوگ خیال کرتے کہ

متکبر ہیں لیکن یہ پندار نہیں طبیعت کی سنجیدگی تھی - عموماً
لئے دیے رہتے جس سے ملاقاتی سمجھتے تھے، کہ مغرور ہیں - اپنی
ہی وضع کے آدمی تھے اور اس وضع کو آخر وقت تک نبھاتے رہے -
کانگرسی کم، سماجی زیادہ اور اخبار نویس ان دونو سے بھی زیادہ -
ہندو تھے اس لئے ان سے یہ گلہ شاید بے جا ہو کہ ہندوؤں کی
حمایت میں غلط یا صحیح کمر بستہ رہتے - وہ عقیدۃً سمجھتے تھے
کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے - انہیں ہندو مسلم اتحاد اسی حد تک
عزیز تھا جس حد تک کہ مسلمان اقلیت، ہندو اکثریت کے تابع
ہو اور جمہوری اصولوں کے مطابق تعداد کو ملحوظ و مقدم رکھا
جائے - لیکن پنجاب میں اس اصول کو بھی طاق پر رکھتے تھے -
یہاں انہیں ملازمتوں میں ہندوؤں کی تعلیمی برتری کا خیال رہتا -
اور اس کے لئے سینہ سپر ہو کر قلم اٹھاتے - لیکن ایڈیٹر کے قلم
یا اخبار کی آزادی کا سوال ہو تو وہ عقیدہ و مذہب کی تمیز سے
بالا ہو جاتے تھے -

۱۹۳۶ء میں روزنامہ انقلاب پر حکومت کی طرف سے کوئی
افتاد آئی تو مجھے یاد ہے کہ وہ ایڈیٹروں کی میٹنگ میں فی نفسہ
شریک ہوئے - یہ میٹنگ دفتر انقلاب ہی میں منعقد ہوئی - مہاشہ جی
نے حکومت پر نکتہ چینی کی اور انقلاب کو اس کی آزادی کے مسئلہ
میں اپنی حمایت کا یقین دلایا - واضع رہے کہ انقلاب اور پرتاپ
میں بعد المشرقین تھا - دونو ایک دوسرے کے افکار و نظریات کے
سخت مخالف تھے بلکہ خیالات کے میدان میں ایک دوسرے سے گتھم

گتھا ہوتے تھے۔

مہاشہ جی کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ اپنوں کے ہاں نہ پرایوں کے ہاں، عمر بھر وزرأ اور سرکاری افسروں کو حسرت ہی رہی کہ وہ ان سے ملیں۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی کے بعض اصول وضع کر لئے تھے۔ جس پر مرتے دم تک عمل کرتے رہے۔ ایک روایت کے مطابق زندگی میں انہوں نے صرف ایک دفعہ خم محسوس کیا۔ اس کے بعد پرتاپ کٹر فرقہ پرست ہو گیا اور اس نے فرقہ وار مسئلہ کو ہوا دینے اور اس میں ہندو نقطۂ نگاہ سے شدت پیدا کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی کی۔ اصلیت کیا تھی یہ قدرت جانتی ہے۔ اس خم کا باعث ان کے بڑے بیٹے مہاشہ ویریندر کی گرفتاری تھی جو لاہور میں گورنر شوٹنگ کیس کے سلسلہ میں پکڑے گئے تھے۔ مردان کے ایک نوجوان ہری کشن نے پنجاب یونیورسٹی کا نووکیشن کے موقع پر سر جافرے ڈی مونٹ مارنسی پر ریوالور سے فائر کئے۔ گورنر بال بال بچ گیا۔ گولی ایک ہیڈ کنسٹیبل چنن سنگھ کے سینہ میں لگی اور وہ مر گیا۔ ہری کشن تو پھانسی پا گیا لیکن جو نوجوان اس "سازش" میں پکڑے گئے۔ ان میں مہاشہ جی کے بیٹے ویریندر اور لالہ خوشحال چند خورسند کے بیٹے رنبیر بھی تھے۔ رنبیر کو پھانسی کی سزا ہوئی جو ہائی کورٹ میں کالعدم ہو گئی۔ اور وہ رہا کر دئیے گئے۔ ویریندر شیخی بگھارنے میں پکڑے گئے۔ آخر اپنے پتا مہاشہ کرشن کی "مساعی" سے رہا ہو گئے۔ اولاد بڑے بڑوں کو جھکا دیتی ہے۔ مہاشہ کرشن اس معاملہ میں سبک

سر ہوئے ہوں تو الگ بات ہے لیکن عمر بھر انہوں نے کبھی کسی وزیر کو منہ نہیں لگایا نہ کسی افسر کا طواف کیا - دعوتوں سے اجتناب برتا ، میل ملاپ کی ارزانی سے گریزاں رہے - اپنے حلقۂ احباب کو محدود رکھا - قلم کی آبرو کا انہیں بہت خیال رہا - کسی شخص کی ترغیب و تحریص پر کبھی نہ لکھا - جو لکھتے اپنے دماغ سے لکھتے - کبھی یہ خواہش بھی نہ کی کہ بڑے لوگوں سے تعلقات پیدا کریں - حتیٰ کہ کانگرس کے زعماء سے بھی کنارہ کش ہی رہے - اپنے گھر میں رہتے اور قرب اقتدار کی نفی پر زندگی بسر کرتے تھے -

صوبجاتی خود اختیاری کے بعد وزارتوں نے اخبارات کو اپنے ڈھب پر لانے کے لئے بہت سے جتن کئے - پنجاب کے مسلمان اخبار تو بالواسطہ یا بلاواسطہ سکندر وزارت کے ہاتھ میں چلے گئے - مولانا ظفر علی خاں جیسا باغی فطرت انسان بھی سکندر حیات کے ڈھب پر آ گیا - لیکن مہاشہ کرشن ایک ہی اخبار نویس تھے جن سے سکندر حیات نے ملاقات کرنے کی بہت سی کوششیں کیں مگر وہ ان کے ہاں جا کر ملنے کے لئے تیار نہ ہوئے - فی الجملہ وہ انا کے بادشاہ تھے - ان کا دھرم تھا کہ اخبار نویس کا حکومت کے دروازہ پر دستک دینا قلم کی غیرت کے خلاف ہے - ان کی تحریروں سے حکومت کو خوف محسوس ہوتا تھا اور ان کے اداریے بڑی توجہ سے پڑھے جاتے تھے وہ اپنے اداریوں سے ہندوؤں میں ایک تحریک پیدا کر سکتے اور اس تحریک کے نتائج بھی لا سکتے تھے - پنجاب

کا ہندو ذہن ان سے بڑی حد تک متاثر تھا اور اس تاثر کے سلسلہ میں انہیں اپنے قلم پر بڑا ناز تھا - - - - - - -

میں نے جس زمانہ میں انہیں دیکھا ان کے دائیں ہاتھ میں رعشہ تھا - خود مضمون نہیں لکھتے تھے - بلکہ لکھاتے تھے معمول یہ تھا کہ صبح سویرے مقامی اخبار پڑھ کر فارغ ہو جاتے پھر منشی آ جاتا اس کو ناشتہ سے قبل اداریہ لکھاتے - ایک زمانہ تک خان غازی کابلی ان کے منشی رہے - ان سے پہلے وقار انبالوی تھے - انہیں اپنے فرائض کی تنخواہ کے علاوہ اس کا ساڑھے سات روپے ماھانہ الاؤنس ملتا تھا - خان کابلی کا بیان ہے کہ مہاشہ جی ٹہلتے ہوئے اداریہ لکھواتے تھے - وقار انبالوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ مہاشہ جی نے فارسی ایف اے تک پڑھی تھی - اسلامی تاریخ سے واقف تھے - مولانا ابولکلام آزاد کی کتابوں کا مطالعہ بھی شوق سے کرتے تھے اس لئے نسبتہً اظہار خیال میں انہیں رکاوٹ نہیں ہوتی تھی - البتہ انہیں اس بات کی شکایت رہتی تھی کہ منشی اور کاتب بعض جگہ املا و انشا کی غلطیاں کر جاتے ہیں - اردو میں ہندی کے پیوند ضرور لگاتے تھے اور اس کی وجہ ان کا سماجی ذہن تھا -

مولانا ظفر علی خاں بھی وزیر آباد سے دو میل دور کرم آباد کے تھے - جو اُن کے پر دادا مرحوم چودھری کرم الہی نے بسایا تھا - مہاشہ جی بھی وزیر آباد کے تھے اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ پنجاب کے بعض بڑے بڑے صحافی ضلع گوجرانوالہ میں

پیدا ہوئے - مثلاً مولانا ظفر علی خاں اور مہاشہ کرشن کے علاوہ
سردار دیوان سنگھ مفتون اور قاضی احسان اللہ مرحوم بھی گوجرانوالہ
کے تھے - ان کے علاوہ ضلع گجرات کو بھی یہی شرف حاصل تھا -
سید حبیب اور خوشحال چند مہاشہ خورسند دونو جلالپور جٹاں ضلع
گجرات کے رہنے والے تھے - ان تمام ایڈیٹروں نے جو اپنے اخباروں کے
مالک بھی تھے قلم کا سفر بڑے معمولی حالات میں شروع کیا - بلکہ
یوں کہئیے کہ زندگی کی عمارت کو خود کھڑا کیا تھا - مولانا ظفر علی
خاں تو خیر ایک خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے -
زمیندار ان کے والد نے جاری کیا تھا - جو جموں و کشمیر میں
ڈاکخانوں کے سپرنٹنڈنٹ تھے - لیکن مہاشہ کرشن طالب علمی
ہی میں آریہ سماج کے ہو گئے - بی اے کیا تو نواں کوٹ میں
تین روپے ماہوار کی ایک کوٹھری کرایہ پر لی - اور وہاں سے آریہ
سماج کا پرچار کرنے کے لئے ہفتہ وار پرکاش نکالا - یہ اخبار پرتاپ
کے ساتھ قیام پاکستان تک جاری رہا - لیکن یہ ایک دھارمک
ہفتہ وار تھا - پرکاش میں ہندی اور سنسکرت زبان کے الفاظ کی
کثرت ہوتی لیکن رسم الخط اردو تھا - مہاشہ خوشحال چند
جلالپور جٹاں میں ہوزری کی دکان کرتے تھے - پڑھے لکھے بھی
کوئی خاص نہ تھے - یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ میٹرک پاس تھے
یا نہیں بہر حال ملاپ ان کی بدولت بالا بلند ہو گیا - دیوان سنگھ
مفتون نے حافظ آباد میں بزازی کی ایک دکان سے زندگی کا آغاز
کیا - پھر موگا میں ڈسپنسر ہو گئے - پھرتے پھراتے جرنلزم میں

قدم رکھا ۔ جالب مرحوم کی ہم صحبتی سے چمک اُٹھے اور اتنا نام پیدا کیا کہ ہفتہ وار صحافت میں ” ریاست “ واحد اخبار تھا ۔ جس نے ہندوستان بھر کی ریاستوں کو خوف زدہ کیا اور اپنے قلم کا لوہا منوا لیا ۔ قاضی احسان اللہ مرحوم زمیندار کے ایڈیٹر تھے ۔ وزیر آباد میں مدرس تھے ۔ وہاں سے زمیندار میں آ گئے اور نام پیدا کیا ۔ سید حبیب زندگی کی مختلف کھکڑیں اٹھاتے ہوئے روزنامہ سیاست کے افق پر چمکے اور اپنا نقش بٹھا کر اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

یہ اتفاقات تھے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے اخبار نویس جو پنجاب کی خاک سے اٹھے ان دو ہم زلف ضلعوں کے باشندے تھے اور انہوں نے جد و جہد کر کے زندگی کی لو کو روشن کیا تھا ۔ ان دنوں کسی روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی تنخواہ سو روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھی ۔ ہندو اخباروں میں تو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی ۔ مسلمانوں کا حال ذرا پتلا تھا ۔ بسا اوقات دو یا تین ماہ کے بعد ایک ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ قسطوں میں مل جاتی تھی ۔ لیکن ایڈیٹروں اور ان کے نائبوں کا عقیدہ تھا کہ وہ قلم کو بیوپار کی چیز نہیں سمجھتے تھے اور نہ اخبار نویسی کو صنعت کا درجہ دیتے ہیں ۔ وہ اس کو عبادت کا ایک حصہ سمجھتے اور وہی لکھتے تھے جو ان کا ضمیر ان سے مطالبہ کرتا تھا ۔ مہاشہ کرشن نے اخبار نویسی کو نہ صرف توقیر بخشی بلکہ ان کی زندگی ایڈیٹروں کے لئے ایک نمونہ ہو گئی ۔ وہ قلم فروش مالک و مدیر نہ تھے بلکہ خود شناس مالک و مدیر تھے اور یہی جذبہ اپنے پڑھنے والوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے ۔

نرمی کا جواب نرمی سے اور سختی کا جواب سختی سے دیتے تھے -

کٹر ہندو ہونے کے علاوہ دھڑے کے پکے تھے۔ وقار انبالوی کے الفاظ میں اخبار نویس برادری کا بلا لحاظ ہندو مسلمان لحاظ کرتے تھے - کئی ایک مسلمان تھے جنہیں وقتاً فوقتاً مالی امداد دیتے رہے - لیکن ان کی زبان سے کبھی ذکر نہ ہوا - انگریز دشمنی ان کے رگ و ریشہ میں تھی - لیکن مغربی جمہوریت کے شیدائی تھے - وہ انتقال اقتدار کے حق میں تھے لیکن تقسیم اقتدار کے مخالف تھے - وہ مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں اجنبی ہی سمجھتے تھے - وہ مذہب کے بڑے حامی تھے - جواہر لال نے ایک دفعہ نفس مذہب کے خلاف بیان دیا تو انہوں نے اداریوں میں سخت تنقید کی اور لکھا کہ مذہب کے بغیر حیوان اور انسان میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے - وقار انبالوی ان دنوں پرتاپ کے شاعر خاص تھے - انہوں نے اپنی طرف سے ایک نظم لکھ کر شامل کر دی - اس نظم کے ابتدائی دو شعر یہ تھے -

نا کام سیاست ہے تو مذہب کی طرف آ
بت خانہ سے نکلا ہے تو یثرب کی طرف آ
باطل سے لڑائی اگر آساں نہیں اتنی
حیران نہ ہو قاتل مرحب کی طرف آ

ہندوؤں کا پرانا طبقہ جو فارسی اور عربی سے آشنا ہونے کے علاوہ اسلامی اصطلاحات کو بھی بخوبی سمجھتا تھا ان اشعار کو پڑھ کر جز بز ہوا - انہوں نے مہاشہ جی سے شکایت کی - مہاشہ جی نے

پہلے شعر کے مصرعہ ثانی میں یثرب پر انگلی رکھ کر کہا وقار صاحب یہ ثی رب کیا ہے - وقار نے فوراً کہا کہ عربی کتاب میں کاشی کا یہی نام آیا ہے - مہاشہ جی نے پوچھا قاتل مرجب کون ہے ؟ وقار نے جواب دیا کہ کرشن اور کنس کی لڑائی کی طرف اشارہ ہے - کہنے لگے میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن ایک صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے - مجھے یہ کہیں لکھا ہوا نہیں ملا - وقار نے جواباً کہا - جناب وہ قرآن ہے - یہ حدیث ہے - حدیث و قرآن کا فرق واضع کیا - مہاشہ جی اس وقت تو چپ ہوگئے لیکن اگلے روز جب مولانا عبدالمجید سالک نے بھانڈا پھوڑ دیا تو وقار پرتاپ سے غیر حاضر ہوگئے - دس پندرہ روز بعد بلاوا آ گیا کہ جو ہوا سو ہوا کوئی بات نہیں - واپس آ جاؤ -

ان دنوں پرتاپ اور ملاپ میں کوئی درجن بھر مسلمان صحافی کام کرتے تھے - شاعروں میں وقار انبالوی کے علاوہ انعام اللہ خاں ناصر ، ناظم سیوهاروی ، سیف اکبر آبادی ، منور خاں ساغر پختہ مشق شاعر تھے - نیوز ایڈیٹروں میں باری علیگ ، اور ملک یوسف العزیز علی الترتیب پرتاپ اور بندے ماترم کے ادارہ میں شریک تھے - ڈاکٹر ستیہ پال نے نیشنل کانگرس نکالا تو اس میں چراغ حسن حسرت ، حمید نظامی اور باری علیگ کام کرتے رہے - مگر جلد ہی الگ ہو گئے -

مہاشہ جی کو سادہ اردو کا بہت خیال رہتا - وہ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے سے تو نہ چوکتے تھے لیکن عربی اور

فارسی کے الفاظ پر ضرور ٹوکتے ۔ ایک دفعہ سیف اکبر آبادی نے کوئی نظم لکھی جس میں مادرِ ہندوستان آتا تھا ۔ مہاشہ جی نے ان سے کہا کہ بھارت ماتا کرو ۔ سیف نے کہا کہ مصرع میں نہیں آتا ۔ مہاشہ جی نے اصرار کیا ۔ سیف نے کہا اگر مصرع کے الفاظ بدل دیں تو بھارت ماتا کے لفظ میں ما کا الف گرتا ہے ۔ مہاشہ جی عروضی جھمیلوں کے آدمی نہ تھے کہنے لگے ۔ ۔ ۔ عروض میں گرتا ہوگا اسلا میں تو نہیں گرتا ۔ یہی لکھ دو ۔

ایک عادت ان میں یہ تھی کہ جو آدمی ایک دفعہ عملے سے چلا جائے اس کو دوبارہ نہیں رکھتے تھے ۔ نانک چند ناز نے پرتاپ کو چھوڑا تو پھر دوستوں کے اصرار اور ناز کی اپنی خواہش کے باوجود دوبارہ نہ رکھا ۔ ان کا خیال تھا کہ جو شخص ایک دفعہ ساتھ چھوڑ بیٹھے اس کو دوبارہ ساتھی بنانا شدید غلطی ہے ۔ کیونکہ اس صورت میں نہ صرف آدمی کا اپنا اعتماد کمزور ہوتا ہے بلکہ قوت ارادی بھی مضمحل ہو جاتی ہے ۔

دوسری جنگ عظیم میں مجھے سات برس قید ہوئی تھی ۔ میں نے اس کا بیشتر حصہ منٹگمری جیل میں گذارا ۔ دوسرے یا تیسرے سال مجھے آشوب چشم ہو گیا ۔ بہتیرا علاج کیا لیکن آرام ہی نہ آتا تھا ۔ میرے والد نے سنا تو سخت پریشان ہوئے میں نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ پریشان نہ ہوں جو اللہ کی رضا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا ۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کا ایک بیٹا وطن پر

قربان ہو گیا ہے ۔ اگر ملک کی آزادی کے لئے آنکھیں چلی جائیں
تو کیا ہے ؟ ہمارے سامنے بہت سے نوجوان تختہ دار پر لٹک گئے
ہیں ۔ ابا جی سے یہ خط خان کابلی نے لے لیا ۔ مہاشہ جی کو پڑھایا ۔
انہوں نے " سکندر حیات خدا سے ڈرو " کے زیر عنوان ایک اداریہ
لکھا ۔ جس میں سکندر حیات کو خدا کا خوف دلاتے ہوئے متوجہ
کیا کہ شورش کاشمیری بھی والدین کا نور نظر ہے ۔ تمہارے عہد
میں اس کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے ۔ اور تمہارے کانوں پر جوں
تک نہیں رینگتی ۔ مہاشہ جی نے یہ خط نقل کیا اور اس پر تحسین
کرتے ہوئے لکھا کہ میرے ملک میں اس قسم کے بے جگر نوجوان
بھی ہیں جو وطن عزیز سے اتنی محبت رکھتے اور قربانی و استقامت کے
لحاظ سے اتنے جری ہیں ۔ انہیں نہ کسی صلے کی خواہش ہے نہ اس
کی امید رکھتے ہیں اور نہ اس کا امکان ہے کچھ عرصہ بعد میں
منٹگمری سنٹرل جیل سے چالان ہو کر لاہور آیا تو سنٹرل جیل میں
مہاشہ جی سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی ۔ وہ چودھری کرشن گوپال دت
کی ملاقات کو آئے تھے ۔ کہ میرا تعارف ہو گیا ۔ اُچھل پڑے ۔
تم شورش کاشمیری ہو ۔ اگلے روز میرے متعلق زناٹے کا ایک مقالہ
لکھا جس میں ایک انقلابی مرہٹہ نوجوان کا حوالہ دیتے ہوئے میری
بے حد تعریف کی ۔ اور یہاں تک لکھا کہ جس قوم یا ملک میں اس
قسم کے نوجوان ہوں وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتی ہے ۔ ان کی
جد و جہد ایک روز ضرور رنگ لائے گی ۔

پرتاپ کے جس شمارے میں یہ اداریہ تھا وہ لاہور سنٹرل جیل

کے سیاسی قیدیوں نے پڑھا تو حیران رہ گئے ۔ مہاشہ جی اپنے قلم سے شاذ ہی کسی کی تعریف کرتے تھے ۔ اور یہ میرے لئے بہجت کا باعث تھا ۔

میری اُن سے یہ پہلی اور آخری بالمشافہ ملاقات تھی ۔ اس کے بعد میں ان سے کبھی نہ ملا ۔ رہا ہو کر بھی ان سے ملاقات نہ ہو سکی ۔ تھوڑے دنوں بعد ملک کے حالات کی رفتار ہی دوسری ہو گئی ۔ حتیٰ کہ بٹوارہ ہو گیا ۔ مہاشہ جی کو لاہور سے نکلنا پڑا ۔ انہوں نے دہلی میں قیام کیا اور وہیں سے پرتاپ نکالا ۔ میرا خیال ہے کہ وہ لاہور کے پاکستان میں چلے جانے کا تصور بھی نہ کرتے تھے ۔ ان کے سامنے بٹوارہ کی وہ شکل لازماً نہ ہو گی جو ہندوستان کو پیش آئی ۔ لیکن خود تقسیم ہو کر بھی انہوں نے تقسیم کو دل سے قبول نہ کیا ۔

قائداعظم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ پاکستان کے مؤقف کو مسلمانوں میں عام کرنے کا باعث ہندو اخبار بھی ہیں جنہوں نے اس کی مخالفت کرکے مسلمانوں کے دل پر نقش کر دیا ہے کہ جس چیز کی مخالفت وہ کر رہے ہیں لازماً مسلمانوں کے فائدہ میں ہے ۔ اگر ہندو اخبار پاکستان کی مخالفت نہ کرتے اور مسلمانوں کے حقوق کے متعلق فراخ دلی کا ثبوت دیتے تو سیاسی نقشہ مختلف بھی ہو سکتا تھا ۔ لیکن ہندو اخباروں نے آخر وقت تک اپنے تعصب کو بر قرار رکھا نتیجتہً پاکستان کا مطالبہ قوی ہوتا گیا اور جس نصب العین کو مسلم لیگ کی قیادت اپنے وسائل سے عام نہ کر سکتی تھی وہ ہندو

اخباروں کے پراپاگنڈہ اور اس کے زہر سے ایک طاقتور مؤقف بن گیا۔

مہاشہ جی نے اس بٹوارہ سے کیا محسوس کیا - دلوں کا بھید خدا جانتا ہے لیکن لاہور انہیں دہلی میں بھی یاد آتا رہا اور اپنے اداریوں کے بین السطور میں اس کے لئے آہیں بھرتے رہے - اس صدمہ نے ان کی صحت کو ختم کر دیا مگر ان کے نقطۂ نگاہ میں اور شدت بلکہ سنگینی پیدا ہو گئی - دہلی سے مسلمانوں کے انخلا و اخراج اور یو پی میں ہندو عصبیت کے قہر و غضب میں ان کے قلم کا بھی حصہ تھا - انہوں نے اور اس کے بعد ان کے جا نشینوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو کبھی معاف نہ کیا - مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی کڑی نکتہ چینی کرتے رہے - ایک دفعہ جانے کسی مسئلہ پر جل بھن کے لکھا کہ ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہیں عملاً مولانا ابوالکلام آزاد ہیں - غور کیا جائے تو وہ شخص جس نے اپنی زندگی کا آغاز نواں کوٹ لاہور میں تین روپے ماہانہ کی کوٹھری سے کیا تھا ہر لحاظ سے ایک کامیاب انسان رہا - اور سرخ رو ہو کے مرا -

وہ پہلے پنجاب پھر دہلی کے سب سے بڑے اردو روزنامہ کے مالک و مدیر تھے ان کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی ان کے دونو بیٹے ان کی زندگی میں اخباروں کے مالک و مدیر ہوگئے سب سے بڑی خوبی جس سے ان کی سیرت کا ستارا چمکتا ہی رہا یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات کسی قیمت پر بھی تیاگ دینے کو تیار نہ ہوئے - انہی خیالات کے لئے وہ جیتے رہے انہی خیالات نے انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالا - جس سے ان کی شخصیت کا ہیولیٰ تیار ہوا اور آخر انہیں

خیالات کے سفر میں یمین و یسار سے بے نیاز سؤرگ باش ہو گئے۔

وہ مسلمانوں کے حریف تھے اور انہیں ہندوستان میں مسلمانوں کا انفرادی وجود ہی گوارا نہیں تھا۔ لیکن ان لے پالک مسلمان ایڈیٹروں سے وہ کہیں زیادہ مسلمانوں کے دوست تھے جو فی زمانہ قلم کے بیوپاری کی حیثیت سے خیالات کی نیچہ بندی کر رہے ہیں۔ افسوس کہ اُس پائے کے حلیف بھی نہیں ملتے ہیں۔

سیّد حبیب

۱۹۳۲ء تک لاہور میں مسلمانوں کے تین اخبار تھے۔ زمیندار انقلاب اور سیاست ۔ پہلے اور بعد کچھ اور اخبار بھی نکلے لیکن نام انہی کا نوک زباں رہا ۔ احسان نے بڑا نام پایا حسرت اورمیکش جیسے صحافی اس کے ادارہ میں رہے ۔ مگر جو روائیتیں ان تین اخباروں سے مخصوص ہو گئی تھیں ان سے احسان آخر وقت تک محروم رہا احسان بہر حال ایک پبلشر کا اخبار تھا ۔ اور ان تینوں کے مالک خود مدیر تھے یہی وجہ ہے احسان ایک روایت نہ بن سکا حکایت ہو کر ختم ہو گیا احسان سے پہلے ایڈیٹروں اور کاتبوں نے مل کر ۱۹۳۰ء میں انصاف جاری کیا مگر قلت سرمایہ کھا گئی جمہور نکلا لیکن اوائل عمر ہی میں چل بسا زمیندار سے عبدالباقی اور صدیق طبیب نے الگ

ہو کر آزاد نکلا چاروں طرف چکا چوند پیدا ہو گئی مگر بیل منڈھے نہ چڑھی حسرت و میکش نے احسان کو تیاگ دیا تو شہباز کی نیو رکھی شہباز اُڑا لیکن آخر کار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خراب کر گئی شاہیں بچہ کو صحبت زاغ

حسرت پہلے نکل گئے عرصہ بعد میکش نے استعفیٰ دے دیا ۔ شہباز خضر حیات ٹوانہ کی ملکیت ہو کر دست آموز شاہ ہو گیا نام اور کام پہلے تین اخباروں ہی کا چلتا رہا ۔ اور اس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایک تو مالک ہی ان کے مدیر تھے دوم انہوں نے اپنی ایک خصوصیت قائم کر لی تھی سوم ان کی اخبار نویسی میں سیاسی ادبی اور عمرانی راہنمائی کے انداز پائے جاتے تھے ۔ چہارم ان اخباروں نے مقابلتاً سب سے زیادہ عمر پائی اس کے علاوہ زمیندار اور انقلاب میں ادبی وجاہتیں بھی عام تھیں اداروں میں ملک کے نامور اہل قلم تھے اور عام مقالہ نگار بھی بڑے پائے کے لوگ تھے گو سیاست کو یہ امتیاز حاصل نہ تھا لیکن زمیندار اگر میر تھا اور انقلاب میرزا تو سیاست کو مصحفی کا مقام ضرور حاصل تھا ۔ وہ ریختہ اور ریختی دونوں میں گالی دے لیتا تھا ۔

سید حبیب نے زندگی میں بڑے پاپڑ بیلے والد فوج میں تھے خود بھی میٹرک کر کے فوج ہی میں چلے گئے لیکن جلد ہی سبکدوش ہو گئے بڑے دنوں ادھر ادھر رہے آخر شمس العلماء سید محمد ممتاز علی کے دارالاشاعت میں کلرک ہو گئے وہاں اخبار نویسی کی لت پڑی تو مقامی اخباروں میں لکھنا شروع کر دیا اور خاصی مشق بہم پہنچا لی

لیکن یہ زمانہ ایسا تھا کہ لاہور یا پنجاب کی فضا اخبار نویسی کے حق میں ساز گار نہ تھی سرمائیکل ایڈوائر نے دشنہ و خنجر دونو تیز کر رکھے تھے شاہ صاحب لاہور سے نکلے کلکتہ پہنچ گئے وہاں نقاش جاری کیا تحریک خلافت میں لاہور آ گئے سیاست نکالا قید ہو گئے۔ طبیعت میں اکل کھرا پن تھا بعض ایسی عادتیں اٹکا لی تھیں کہ آخری عمر میں پریشانی کا باعث ہوئیں۔ مثلاً فقیری میں شاہی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن فقیری اور شاہی دونو ان کی قدرت سے باہر تھیں اس زمانہ میں نیوز پرنٹ کا رم ایک روپے اور کچھ آنے میں آتا تھا سستا سمے تھا کاتبوں کی تنخواہیں معمولی تھیں وہ دوسرے تیسرے ماہ تنخواہ پا کر بھی خوش ہو جاتے ادھر ایڈیٹروں کے لئے یہ تھوڑی خوشی تھی کہ ایڈیٹر ہیں مسلمان اخباروں کے دفتر کراؤن بس کے اڈے سے شروع ہو کر دہلی دروازہ کی جہازی بلڈنگ تک ختم ہو جاتے تھے۔ انقلاب کا دفتر فلیمنگ روڈ پر ربن پریس کے سامنے تھا سیاست کا، مزار شاہ محمد غوث کے بالمقابل۔ زمیندار دہلی دروازے کے باہر جہازی بلڈنگ میں تھا اس سڑک پر کھانے پینے کی دوکانیں عام تھیں جس ایڈیٹر کو تنخواہ وقت پر ملتی وہ ظہور مسلم ہوٹل سے کھانا کھاتا جس کو وقت پر نہ ملتی وہ عرب ہوٹل کا گاہک ہوتا باقی عملہ فعلہ مولا داد کے ہوٹل میں احراری پلیٹ کھا کے گذر بسر کر لیتا تھا ڈھائی تین آنے میں پیٹ بھر جاتا مزار شاہ محمد غوث کے آمنے سامنے پٹھانوں کے چائے خانے تھے ٹکے میں نان اور آنے میں چائے کی چینک، دن بھر اخباروں کے دفتر میں چائے کے فنجان چلتے،

ایک ایڈیٹر کے لئے آدھا نان ، چائے کی ایک پیالی اور حقہ کے لگا تار کش صریر خامہ کو نوائے سروش بنانے کے لئے کافی و وافی تھے -

یہ کہنا مشکل ہے کہ سیاست بکتا بھی تھا یا نہیں ؟ تھوڑا بہت ضرور بکتا ہوگا لیکن چھپتا باقاعدہ تھا - اور جن لوگوں کے ہاں اسے جانا چاہیئے تھا وہاں باقاعدگی سے جاتا تھا اشتہار مسلمان اخباروں کی قسمت سے خارج تھے بڑے اشتہار ہندو اخباروں ہی کو ملتے تھے ۔ مسلمان اخباروں کی قسمت میں " نیپالی گولیاں " " اٹھرا کا شرطیہ علاج " اور " شرمائیے نہیں " قسم کے اشتہارات تھے جو اڑھائی پیسے فی انچ پر بک ہو جاتے - شاہ صاحب کا معمول تھا کہ وہ ہر ماہ کے آخری پندھرواڑے مختلف شہروں کے دورہ پر چلے جاتے اور نذرانہ وغیرہ لے کر لوٹ آتے - پنجاب کے زمینداروں ، یوپی کے تعلقداروں ، اور دہلی سے کوہاٹ تک کے پیروں ، سے ان کے اسی قسم کے مراسم تھے - شاہ صاحب انہیں اپنے خزانہ الفاظ کے بڑے بڑے القابات سے نوازتے اور وہ شاہ صاحب کو اپنے جیب و دامان سے عشر دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتے تھے - اس تگ و دو میں انہوں نے کولمبس کی طرح بعض ایسی ریاستیں اور ان کے جلالۃ الملک بھی دریافت کئے کہ ملک بھر میں ان کا چرچا ہو گیا ہر مہینے کی پہلی تاریخ یا ایک آدھ دن آگے پیچھے دفتر میں تشریف لاتے - جو رقم اکٹھی کی ہوتی انہیں حصہ رسدی کے مطابق تقسیم کرتے ہم زلف کو خزانچی مقرر کر رکھا تھا گھنٹی بجا کر اندر بلواتے ارشاد ہوتا ان دو لفافوں میں چھوٹی اور بڑی بیگم کے ماہانے ہیں - یہ رقمیں ان کے گھروں میں فوراً

پہنچا دو۔ پھر عملہ کی تنخواہ جنرل منیجر کے سپرد کرتے اور ہفتہ عشرہ لاہور میں رہ کر سفر وسیلہ ظفر کا نعرہ لگاتے ہوئے کسی نئی دریافت پر روانہ ہو جاتے۔ سفر ہمیشہ سیکنڈ یا فرسٹ کلاس میں کرتے معمولات میں رتی بھر فرق نہ آتا اداریہ لاہور میں رہ کر بھی لکھتے اور اور لاہور سے باہر جا کر بھی، خشمناک ہوتے تو اپنے کناروں کو بھی توڑ پھوڑ کر بہا لے جاتے، کوئی بند لگنا یا لگانا محال تھا۔

ادیب تو نہیں لیکن خطیب بہت اچھے تھے۔ آواز میں گونج اور گرج تھی بات مطلب کی کرتے ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں نہ مارتے۔ آخری دنوں میں معاش کے لئے شاعری بھی کی، جیل میں ''جپ جی'' کا ترجمہ کیا مہاراجہ پٹیالہ کے پاس لے گئے۔ ان سے انعام پایا یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب سردار سکندر حیات سے لڑ بھڑ کر اپنے آپ کو تباہ کر لیا تھا اور رزق و معیشت کے تمام دروازے اپنے آپ پر خود ہی بند کر لئے تھے۔

جس بات پر ڈٹ جاتے، ڈٹے رہتے جھکنا سیکھا نہ تھا، شہید گنج کی تحریک میں میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی سے الجھے تو آخر وقت تک الجھے رہے معاف کرنا ان کے ہاں تھا ہی نہیں پیر جماعت علی شاہ سے خوش تھے تو انہیں قبلۂ عالم و عالمیان لکھتے رہے بگڑے تو علیک سلیک بھی گوارا نہ کی اور وہ کھری کھری سنائیں کہ توبہ ہی بھلی ہربرٹ ایمرسن صوبہ کا گورنر تھا ایک وفد کے ہمراہ اس سے ملے روزوں کے دن تھے افطار کا وقت ہو گیا پانی مانگا تو گورنر نے نلکے کی طرف اشارہ کر دیا بس یہ بگڑ

جانے کے لئے کافی تھا گورنر کو وہیں آڑے ہاتھوں لیا بدمزگی ہو گئی اگلے روز سیاست میں مقالہ لکھا کہ ایمرسن نے اس بدتمیزی کا مظاہرہ کر کے انگریز قوم کے اخلاق کو مجروح کیا ہے محکمہ اطلاعات نے گورنر کی طرف سے تردید کی تو شاہ صاحب نے اداریہ لکھا ''گورنر کا جھوٹ'' دوبارہ تردید آئی تو لکھا ''گورنر نے پھر جھوٹ بولا'' غرض آن واحد میں لڑائی باندھ لی اور حق تو یہ ہے کہ تن گئے اسی اثنا میں سکندر حیات سے چھڑ گئی افتتاحیہ دھر گھسیٹا ''سر الیگزینڈر عرف کاٹھ کا اُلو'' طراز عنوان فردوسی کا مصرع تھا --------- ع

پرستار زادہ نہ آید بکار

زمانہ تھا کہ لالہ ہرکشن لال گابا پنجاب میں تجارت کے بادشاہ تھے - اب وہ دنوں ہی میں دیوالیہ ہو گئے - اور ان کے خلاف عدالت عالیہ میں مقدمہ چل رہا تھا - عام تاثر یہ تھا کہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جج سرڈگلس ینگ نے انہیں تباہ کیا ہے - شاہ صاحب نے ینگ پر نکتہ چینی کی - توہین عدالت کا مقدمہ کھڑا ہو گیا - سید عنایت شاہ (برادر خورد) سیاست کے پرنٹر پبلشر تھے - انہیں طلب کیا گیا - جس بینچ نے ساعت کی وہ دیوان رام لعل اور ڈگلس ینگ پر مشتمل تھا - شاہ صاحب کی طرف سے کوئی وکیل نہ تھا - ینگ نے دیوان رام لعل کی وساطت سے پوچھا ''آپ کے ساتھ کوئی وکیل ہے ؟''

''جی نہیں''

" کیا آپ نے کوئی وکیل نہیں کیا ؟ "
" اس مقدمہ میں کوئی وکیل پیش ہونے کو تیار نہیں "
" کیوں " ؟
" وہ اس عدالت سے خوف زدہ ہیں "
"آپ غلط کہہ رہے ہیں - آپ فیس نہیں دینا چاہتے ہوں گے -"
" ایسی بات نہیں جناب میں نے جو کچھ بیان کیا وہ صحیح ہے "
" آپ نام بتا سکتے ہیں ؟ "
" جی نہیں ! میں کسی کے خلاف شکایت نہیں کرنا چاہتا -"
" آپ انگریزی میں بات کریں "
" مجھے انگریزی نہیں آتی "
" آپ نے جو کچھ لکھا معافی مانگنے کے لئے تیار ہیں " ؟
" جی نہیں - میں نے جو کچھ لکھا صحیح لکھا ہے "
ینگ غصے سے کانپنے لگا -
" اگلی تاریخ پر وکیل ساتھ لے کر آؤ "
" میں کوشش کروں گا لیکن میں نے جو لکھا ہے اس عدالت کے خلاف لکھا ہے لہذا یہ عدالت مستغیث ہو سکتی ہے منصف نہیں " ؟

آئندہ پیشی پر ینگ نے گیارہ سو روپیہ جرمانہ اور ایک ماہ قید محض کی سزا دے دی - اس زمانہ میں گیارہ سو روپیہ گیارہ ہزار روپیہ کے برابر تھا - جلال پور جٹاں میں شاہ صاحب کا ذاتی مکان تھا فروخت کر کے جرمانہ ادا کر دیا -

اس سے پہلے یا بعد میں شاہ صاحب نے ینگ کو ایک خط

لکھا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں ۔ اُس نے اپنے پرسنل اسسٹنٹ سے لکھوا دیا کہ وقت نہیں ہے ۔ شاہ صاحب کو غصہ آ گیا ۔ اپنے چپراسی کی معرفت تحریر کیا کہ شاہ صاحب بھی آپ سے مل کر راضی نہیں ہیں ۔ آپ کے خلاف کچھ الزامات تھے جن کی وضاحت کے لئے وہ آپ سے ملنا چاہتے تھے ۔ اس جواب کے نیچے چپراسی کے دستخط نہیں تھے بلکہ پولیس کی زبان میں ''نشان انگوٹھا'' تھا ۔

غرض اس قسم کے واقعات سے شاہ صاحب عموماً اپنا کام بگاڑ لیتے اور آگ بگولہ ہو جاتے ان لڑائیوں میں وہ اکثر و بیشتر راستی پر ہوتے ۔ لیکن لڑتے وقت راست نہیں رہتے تھے وہ جنگ میں جائز حربے استعمال کرنے سے زیادہ نا جائز حربے استعمال کرنے کے عادی تھے ۔

سید حبیب اور سید عنایت شاہ ایک ہی والدین کی تصویر تھے ۔ لیکن دونو میں زمین و آسمان کا فرق تھا عنایت شاہ میں کشش تھی سید حبیب میں تنفر ۔ عنایت شاہ جس سے ملتے وہ ان کا ہو جاتا لیکن سید حبیب سے قریب ہو کر ہر انسانی تصور پاش پاش ہو جاتا تھا ۔ وہ اپنے سوا کسی کے دوست نہیں تھے ۔ حتیٰ کہ اپنے بھی دوست نہیں رہے تھے آخری دنوں اپنے فرشتہ سیرت بھائی سید عنایت شاہ سے بھی ناراض ہو گئے سردار صلاح الدین سلجوقی ہندوستان میں افغانستان کے قونصل جنرل تھے ۔ جب تک وہ ان پر مہربان رہے گاڑھی چھنتی رہی جو نہی اختلاف ہوا ان کے دشمن ہو گئے ۔ اب جو اُن کے خلاف لکھنا شروع کیا تو خدا کی

پناہ حکومت افغانستان نے حکومت ہند سے شکایت کر کے جیل میں ڈلوا دیا اس طرز کی لڑائیوں میں اعصاب کمزور پڑ جاتے اور آخری نزلہ عموماً اپنوں ہی پر گرتا ہے شاہ صاحب نے اب کے عنایت شاہ کو اس نزلہ کا مستحق گردانا ان کے خلاف زبان کترنی کی طرح چلتی رہی لیکن عنایت شاہ نے مرتے دم تک بڑے بھائی کا ادب ہی کیا

پاکستان بنا تو آمدنی کے سبھی راستے مسدود ہو چکے تھے قلم کے سوا کوئی ہنر ہاتھ میں نہ تھا ۔ جس عہد کا قلم ان کے ہاتھ میں تھا وہ عہد ہی بیت چکا تھا ۔ "غازی" نام کا ایک روزنامہ نکالا جس سے معاش کا ایک ذریعہ قائم ہو گیا کسی تھانے دار نے ایک بڑھیا کو پیٹا ، وہ شکایت لے کر آئی آپ نے اس کی خواہش پر پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس خان قربان علی خان کو فون کیا خان صاحب "انار بکم الا علیٰ" کا مجسمہ تھے ۔ کوئی سخت سست کلمہ کہہ کر فون بند کر دیا اب جو شاہ صاحب نے ان کے خلاف لکھنا شروع کیا تو بہت دور نکل گئے حکومت نے "غازی" کا ڈیکلیریشن منسوخ کر دیا اسی اثنا میں سید عنایت شاہ اچانک حادثہ کا شکار ہو کر رحلت کر گئے ، انکے بیٹے خوش حال تھے اور تایا کی ہر ممکن امداد کو تیار ، لیکن شاہ صاحب کے لئے بھائی کی اولاد کے سامنے جھکنا عیب تھا انہوں نے عبرت کا ہر تازیانہ قبول کیا لیکن عزیزوں میں سبک سر نہ ہونا چاہا ادھر ایک ایک ورق کھلا پڑا تھا مگر وہ پرانے رئیسوں کی طرح تھے کہ رسی جل گئی ہے مگر بل باقی ہیں ۔ نتیجہ معلوم کہ ایک گرتی ہوئی دیوار کی طرح بیٹھ گئے ۔ تحریک خلافت کے

دنوں میں میانوالی ڈسٹرکٹ جیل پنجاب کے اعلیٰ سیاسی قیدیوں کا نشیمن تھا - شاہ صاحب انہی قیدیوں کے ساتھ اس جیل میں رہے - سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیان تھا کہ شاہ صاحب ہم لوگوں سے عموماً الگ رہتے ایک تو انہیں احساس کہتری تھا دوسرے وہ ہم سے علیحدہ رہنے ہی میں برتری سمجھتے تھے ایک روز کہنے لگے کہ میری دو خواہشیں ہیں - ایک یہ ہے کہ مجھ میں ابوالکلام کی متانت پیدا ہو جائے - دوسری یہ ہے کہ ہندوستان آزاد ہو تو اس کا پہلا صدر بنوں - سید عطاء اللہ شا کی روایت کے مطابق ان دونو خواہشوں پر زبردست قہقہہ پڑا - دوسرے یا تیسرے روز شاہ صاحب لنگوٹ باندھ کر نلکے کے نیچے نہا رہے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی ادھر جا نکلے - معاً انہیں شرارت سوجھی شاہ صاحب کو اُٹھا کر پٹخنی دی اور سوار ہو گئے - اب نیچے شاہ صاحب شور مچا رہے اوپر بخاری صاحب قہقے لگا رہے ہیں - تمام ساتھی شور و غل سن کر جمع ہو گئے -

,, خیریت ہے بھائی ؟،، مولانا احمد سعید دہلوی نے پوچھا -

سید حبیب متواتر چلائے جا رہے تھے- شاہ جی نے مولانا احمد سعید سے کہا، حضرت ! صدر تو یہ اس وقت منتخب ہونگے جب ہندوستان آزاد ہو گا - اور نہ جانے کب آزاد ہو لیکن میں نے سوچا ابوالکلام کی متانت پیدا کردوں - بس یہ متانت ہی کا انتظام کر رہا تھا -،،

عمر بھر سید عطااللہ شاہ اپنے اس مذاق پر ان سے گالیاں

کھاتے رہے ۔ انہیں سب و شتم سے روکنا مشکل تھا ۔ سید حبیب اس طرح اور شیر ہو جاتے جب کوئی شخص سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو ان مرصع گالیوں سے مطلع کرتا تو مسکرا دیتے اور فرماتے شاہ صاحب کی تندرستی کے لئے یہ نسخہ مفید ہے ان کے استعمال میں رہنے دیجیئے ہمارا معاملہ تو غالب نے بہت پہلے صاف کر دیا تھا ۔۔۔ ع

گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

سید احمد شاہ (پطرس) بخاری گورنمنٹ کالج میں پرنسپل تھے ۔ شاہ صاحب نے ان کے خلاف قلم اٹھایا تو وہ بہ نفس نفیس دفتر آ گئے ۔ آتے ہی شاہ صاحب سے کہا "از راہ کرم کمرہ بند کر لیجئے مجھے آپ سے خلوت میں کچھ عرض کرنا ہے "

شاہ صاحب سمجھے پطرس شکار ہو گیا ہے ۔ اٹھ کر چٹخنی لگا لی ۔ پطرس نے میز سے موٹا رول اٹھایا اور تواضع شروع کر دی "جی ہاں ایک آرٹیکل اور ہونا چاہیئے" شاہ صاحب نے غل مچا دیا ۔ باہر کے لوگ دروازہ توڑ رہے ہیں ۔ دروازہ ٹوٹتا ہی نہیں پطرس نے مدارات کے بعد بڑے آرام سے دروازہ کھولا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے یہ جا وہ جا ۔

شاہ صاحب نے مولانا ظفر علی خان کو کبھی معاف نہیں کیا ۔ ہمیشہ ان کے خلاف اناپ شناپ اور اول فول لکھتے رہے ۔ مولانا نے کبھی منہ نہ لگایا ۔ علی برادران کی پنجابی ٹولی سے چھڑی تو شاہ صاحب علی برادران کے ہمنوا ہو گئے ۔

زمیندار نے سیاست کو رسید ہی نہ دی ۔ البتہ ہفتہ وار ”ٹوڈی“ نکالا اور سیاست کی مدارات شروع کی ۔ شاہ صاحب نے جواب میں ”آکا باکا“ نکالا ۔ آخر علامہ اقبال نے مداخلت کی اور خرافات کا یہ پشتارہ لپیٹ دیا گیا ۔

افسوس ! اب ان کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں ۔ مرحوم جو کچھ بھی تھے بہرحال ایک جگردار انسان تھے ۔ عدم توازن نے انہیں خراب کیا ۔ طبیعت میں اعتدال دل میں اطمینان اور مزاج میں یکسوئی ہوتی تو موت کے بعد بھی زندہ رہتے اور اس طرح نہ مرتے کہ اخباروں نے ان کی رحلت کا نوٹس ہی نہ لیا ۔ رہ گئی نئی تانتی تو اس کو معلوم ہی نہیں کہ سید حبیب کون تھا کیسے رہا اور کہاں دفن ہو گیا ؟

مرتضیٰ احمد میکش

مرتضیٰ احمد خاں جالندھر کے پٹھان تھے ۔ اپنے نام کے ساتھ بالالتزام درانی الافغانی لکھتے ۔ سادات کی طرح انہیں بھی اپنے پٹھان ہونے پر ناز تھا ۔ اخبار نویسی میں کب آئے کون لایا کہاں سے اُٹھے اور کہاں نکل گئے — یہ سب باتیں خواب خیال ہوتی جا رہی ہیں ۔ نوجوان پود کا نعرہ ہے ۔ " نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو " قدرت یہ چراغ خود ہی گل کرتی جا رہی ہے ۔ اور نوجوان ان چراغوں کو بھولتے جا رہے ہیں ۔

پہلے پہل ان کا نام سنا تو معلوم ہوا کہ لاہور سے فارسی کا ایک ہفت روزہ " افغانستان " نکلتا ہے مرتضیٰ احمد خاں اس

کے ایڈیٹر ہیں امان اللہ خاں کے حامی ، نادر خاں کے مخالف،
بچہ سقہ کے دشمن ، اور انگریزوں کے باغی ، اچانک ہی یہ خبر
بھی آ گئی کہ حکومت نے ان کا ہفت روزہ بند کر دیا ہے -
اور ایڈیٹر کو قانون خارجہ کے تحت ایک سال کے لئے جیل بھیج
دیا ہے - رہا ہونے پر کچھ اور معلومات سامنے آئیں - پتہ چلا
کہ زمیندار میں مدیر معاون رہے ہیں - انقلاب میں بھی ایک
عرصہ کام کیا ہے - وہ عام ایڈیٹروں سے مختلف انسان ہیں - کسی
کو خاطر میں نہیں لاتے - اپنی ہی قابلیت میں مگن رہتے ہیں -
انگریزی سے اُردو ترجمہ کرتے ہیں تو اصل سے بڑھ جاتا ہے - عربی
سبقاً سبقاً پڑھی ہے - اور اس میں در خور وافی رکھتے ہیں -
فارسی ان کے گھر کی لونڈی ہے - اُردو خوب لکھتے ہیں لیکن
لکھنوی دھلوی یا لاہوری کسی اسلوب کے پیرو نہیں ان کا اپنا
اسلوب ہے - زبان گنجلک تو نہیں ، ادق ہوتی ہے - انگریزی کے ہر
لفظ کو مشرف بہ اسلام کر لیتے ہیں - الفاظ کو مفرس یا معرب
کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے - مثلاً اسٹیشن لکھنا ہو تو
استاسیون لکھیں گے - صحافت میں قدم رکھا تو اسی کے ہو گئے
بلکہ صحافت ہی کی معرفت زندگی کے دوسرے شعبوں میں جانے
پہنچانے گئے اُس زمانہ کے ایڈیٹروں کی صحیح تصویر تھے آج کسی
ایڈیٹر کے لئے جامع ہونا ضروری نہیں رہا بس ایک خاص سانچے میں
ڈھل گئے اور ایڈیٹر ہو گئے - جس زمانے کے یہ لوگ تھے اس زمانے
میں ایڈیٹر ادب و سیاست کا جامع ہوتا تھا - مولانا ابوالکلام ،

مولانا محمد علی ، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں متقدمین میں سے تھے۔ غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک ، مرتضیٰ احمد میکش، چراغ حسن حسرت اور قاضی عبدالغفار متوسطین میں۔ قاضی احسان اللہ ، حاجی لق لق اور اظہر امرتسری متاخرین میں۔ لیکن یہ لوگ ایڈیٹر سے زیادہ ادیب و شاعر تھے۔ عملی سیاسیات میں بھی ان کے دم قدم سے رونق رہتی۔ متقدمین کا گروہ تو مسلمانوں کی نشاۃثانیہ کا محرک تھا بلکہ اس کو صف اول کی راہنمائی کا درجہ حاصل ہوا۔ لیکن متوسطین اور متاخرین بھی سیاسیات کے پیچ و خم سے آشنا تھے۔ آج کل کے ایڈیٹروں کی طرح نہیں جو سیاست باز ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ جماعت ساز تھے۔ یہ کچھ تخلیق ہی نہیں کر سکتے۔ وہ تخلیق بھی کرتے تھے۔ ان کے مشوروں سے بڑے بڑے زعماء مستفید ہوتے مثلاً متوسطین میں مہر و سالک غیر معمولی قابلیت کے ایڈیٹر تھے۔ مہر عربی ، فارسی ، اردو کے عالم متبحر ہیں۔ ان کے قلم سے ادبیات و اسلامیات پر جو کتابیں یا مقالے نکلے ہیں وہ یادگار و شاہکار ہیں تاریخ و تفسیر میں بھی انہیں کمال و امتیاز حاصل ہے سالک باغ و بہار تھے۔ پنجاب میں اتنی سادہ و سلیس اُردو شاذ ہی کسی نے لکھی ہو۔ انہوں نے افکار و حوادث میں طنز و مزاح کا ایک نیا روپ دیا جس پر قلم اٹھایا وہی داد دے اٹھا حسرت جیسا ادیب طناز کہاں پیدا ہوتا ہے با محاورہ اردو لکھنے میں جو ملکہ انہیں حاصل تھا اس سے اہل زباں بھی کم آشنا ہیں الفاظ نہیں موتی جھڑتے تھے شعر خوب کہتے اور اگر شعر ہی کہتے تو حسرت موہانی ہو

جاتے قاضی عبدالغفار کا تیکھا پن اب کسی صحافی کے حصہ میں کہاں ؟ اردو اخبار نویسوں کی اکثریت نے فن کو چھوڑ کر پیشہ اختیار کر لیا ہے پہلے اخبار نویسی ایک نصب العین تھا اب صنعت ہے یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ ورکنگ جرنلسٹ کو ملک یا اصول سے سروکار نہیں وہ ایک کیمرا ہے یا اہلکار ہر اخبار اپنی منشاء کے مطابق اس سے کام لے سکتا ہے پہلے اخبار میں فکری مواد ہوتا اور ادب و سیاست پر تنقیدی مقالے آتے تھے اب فیچر آنے لگے ہیں یار لوگوں نے سال کی خوبی پر گاہک کی کمزوری کو ترجیح دی ہے - ظفر علی خاں نے اپنے بھانجے مہدی علی خاں (مشہور شاعر اور افسانہ نگار) کو اس جرم میں زمیندار سے سبکدوش کر دیا تھا کہ اس نے کسی صاحب کی موت پر فوتیدگی کی سرخی جما دی تھی - یا دو مختلف النسل الفاظ میں واؤ عطف آ گیا تھا - آج یہ سب خواب کی باتیں ہیں : زبان غلط لکھیئے - واقعات مسخ کیجئے - اناپ شناپ سجا لیجئے - اول فول بکتے رہیئے سب گوارا ہے - خوبی یہ ہونی چاھیئے کہ آپ اخبار مرتب کر سکتے ہیں -

اگر غازہ رخسار استعمال کرنے کا سلیقہ ہے تو شوق سے غلط زبان لکھیئے - آپ ہی سب سے بڑے ایڈیٹر ہیں -

زبان پہلے قواعد کے تابع تھی - اب اغراض کے اگر آپ ان اغراض کو تحریر میں لا سکتے ہیں تو آپ کے پو بارہ ہیں - پہلے خبریں ڈھونڈی جاتی اب گھڑی جاتی ہیں - جن سیاستدانوں سے پالا پڑا ہے وہ خود زبان نہیں جانتے ان کی زبان درست کرنا اور بیان

بنانا بھی جرنلسٹوں کے فرائض میں ہے۔ وہ جرنلسٹ کس زبان میں اُتارو ہو سکتے ہیں جنہیں اس پیشہ میں شوق نہیں پیٹ لایا ہے رہ گئے جرائم تو جب وہ بغیر ضابطے کے یا ضابطہ توڑ کر ہوتے ہیں تو ان کی خبریں زبان کا ضابطہ کب مانتی ہیں ؟ لکیر کا فقیر ہونا بھی ضروری نہیں۔ اقبال نے کہا تھا ۔۔۔۔۔۔ع

یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

جرنلسٹوں نے اپنے گریباں کی حفاظت کے شوق میں ہزاروں کا دامن پھاڑ دیا ہے۔ چپڑی اور دو دو ان کے بس کا روگ نہیں۔ اخبار بھی نکلے اور زبان بھی صحیح ہو یہ ان کی قدرت سے باہر ہے اور یوں بھی اس زمانہ میں مشکل ہے۔ یہ متقدمین و متوسطین اور گئے دور میں متاخرین کے خال خال افراد کی درد سری تھی کہ پروف ریڈنگ سے لے کر افتتاحیہ نویسی تک کو اپنے فرائض کا حصہ سمجھتے تھے جس زبان کے ایڈیٹر تھے اس کے قواعد بھی جانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ اردو میر و غالب کی زبان ہے۔ ہماری نئی پود میرا جی اور سعادت حسن منٹو کو ''خدا'' سمجھتی ہے۔ نئی نسل کے نزدیک پرانے صحافی اگلے وقتوں کے لوگ ہیں۔ یاد گار زمانہ ! اب ان کی چھاپ نہیں چلے گی۔ صرف و نحو نے اُنہیں پیدا کیا۔ صرف و نحو ہی کے ہو گئے۔ اور صرف و نحو ہی کے ہاتھوں دم توڑا۔ وہ لوگ ہر موضوع پر لکھتے بلکہ لکھنے لکھانے کا تانا بانا لگا رکھا تھا۔ کبھی اپنے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ایڈیٹر تھے فن کار نہ تھے۔ وہ کاتبوں کی غلطیاں پکڑتے تھے۔ کاتب ان

کی غلطیاں پکڑتے ہیں۔ ان کے ہاں نئی نئی اصطلاحیں آ گئی ہیں، بزرگوں کی روحیں بھی ان سے نا آشنا ہیں۔ یہ انقلاب اس تیزی سے آیا ہے کہ پرانے صحافی ایک ایک کر کے گوشہ نشین ہو گئے یا مر کھپ گئے ہیں۔

مرتضیٰ احمد اخبار نویسی کے حلقے سے نکل کے مشائخ کے حلقہ میں چلے گئے تو سفید اُجلی ڈاڑھی نے حلیہ ہی بدل دیا ختم نبوت کی تحریک میں انہوں نے منیر انکوائری کمیشن کے سامنے جس قابلیت اور جس جرأت سے کلمۃ اللہ کی پشتبانی کی وہ انہیں کا حصہ تھا۔ ان کی قابلیت کا کمیشن نے بھی اعتراف کیا لیکن اس رپورٹ میں نہ صرف علماء کا استخفاف کیا گیا بلکہ یہ رپورٹ اسلام کے خلاف مسلمان ججوں کی لکھی ہوئی ایک خطرناک دستاویز ہے۔ رپورٹ چھپ کر سامنے آئی تو لوگ مارشل لاء کی مار کھا کے بے حوصلہ ہو چکے تھے۔ مرتضیٰ احمد نے اس رپورٹ کا تجزیہ کیا اور ان تمام غلط باتوں کی نشان دہی کی جو مصنفین کے قلم سے نکلی تھیں۔ خوف ان کی چمڑی میں تھا ہی نہیں، بلکہ خوف ان سے بھاگتا تھا۔

جتنی خوبیوں کے مالک تھے اتنی قدر نہیں ہوئی بلکہ صحافت کے تذکروں میں بھی ان کا نام نہیں آ رہا وجوہ ڈھکے چھپے نہیں اور نہ ہم انہیں زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے صحافت کی اعلیٰ قدروں کا نہ صرف احترام بلکہ استحکام بھی کیا۔ جس نقطہ نگاہ کو درست سمجھتے اس کے مبلغ ہو جاتے۔ ان میں ایک عالم کی روح ادیب کا حسن شاعر کی رنگینی

رند کا ظرف فقیر کا گداز مجاہد کا ولولہ اور بادشاہ کی تمکنت موجود تھی - قلم فروشی سے انہیں تنفر تھا - اپنے خیال اور اپنے تصور کے آدمی تھے - ابھی پاکستان کا تصور چند افراد کے ذہن میں تھا کہ انہوں نے انقلاب میں مسلسل مقالے لکھ کر پاکستان کو ہندو مسلم مسئلہ کا حل قرار دیا - اس وقت یہ حل مجذوب کی بڑ نہ سہی صحافی کی بڑ ضرور سمجھا گیا - لیکن آخر یہی حل مسلمانوں کا ملی نصب العین ہو گیا - ان کا خیال تھا کہ انہوں نے علامہ اقبال سے بھی پہلے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا - وہ ظاہر و باطن پاکستانی اور ان مخلص اہل قلم میں سے تھے جنہوں نے علیحدہ قومیت کے نظریہ کی آبیاری کی -

---

اپنی فرمانروائی یا سبکدوشی کے زمانے میں غازی امان اللہ خاں نے انہیں چند خطوط لکھے جو ان کے پاس تھے - نادر خاں کی حکومت یہ خطوط حاصل کرنا چاہتی تھی - خود حکومت ہند کی ان خطوط پر نگاہ تھی - مسٹر گاربٹ اسی زمانہ میں چیف سیکرٹری تھے - انہوں نے کئی مسلمان افسروں کو مقرر کیا کہ ان سے یہ خط حاصل کریں لیکن میکش پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہ دیتے تھے - ان سے یہ خطوط حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا - خان بہادر عبدالعزیز سی آئی ڈی کی ناک کا بال اور خان بہادر میرزا معراجدین پولیس کی معراج تھے - یہ لوگ انگریزوں کے لئے سب کچھ کر گذرتے تھے - انہوں نے بہتیرے ہاتھ پیر ہلائے مگر

میکش کہاں پھنستے - ہر شخص ٹکا سا جواب لے کر چپ ہو جاتا -
آغا رشید احمد نام کے ایک صاحب ان دنوں سی آئی ڈی میں
سب انسپکٹر تھے - تقریباً سبھی مسلمان ایڈیٹروں اور لیڈروں سے
ان کے ذاتی تعلقات تھے - میکش صاحب کو رام کرنے کے لئے انہیں
مامور کیا گیا - دونو ایک ہی گاؤں کے تھے - جالندھر میں اکٹھے
پڑھے اور اکٹھے ہی زندگی کے سفر کو نکلے تھے ـ ـ ـ ع

او بصحرا رفت و مادر کوچہ ھا رسوا شدیم

لیکن یہ نشانہ بھی خطا گیا جب کوئی حربہ کار گر نہ ہوا! تو
ان خطوط کی خریداری کے لئے پانچ ہزار روپیہ کی پیشکش کی گئی یہ
وہ زمانہ تھا جب میکش پھٹے حالوں میں تھے کوئی ذریعہ معاش نہ
تھا اور جو تھا اس میں یافت نہ ہونے کے برابر تھی فقر و فاقہ کے
دن تھے اونے پونے بسر ہوتی میکش نے کاملاً استغنا کے ساتھ اس
پیشکش کو ٹھکرا دیا — آغا رشید سے کہا

"جن لوگوں نے یہ پیشکش کی ہے وہ غلط فہمی کا شکار ہیں
وہ اپنے ہی نفس کی میزان میں دوسروں کو تولتے ہیں ایک ھاتھ میں
سورج اور دوسرے میں چاند لے کر بھی چلے آئیں تو بھی وہ مجھ سے
یہ خطوط خرید نہیں سکتے ہیں - - - - - -

ھزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

سانحہ ملاخطہ ہو کہ آخر کار یہ خطوط چوری ہو گئے - میرزا

معراج دین نے سی آئی ڈی کا ایک حوالدار ان کے ہاں نوکر رکھوا دیا جو دنوں ہی میں ان کا معتمد ہو گیا۔ اُس نے خطوط چوری کئے اور بھاگ نکلا۔ میکش سر پیٹ کے رہ گئے۔

مولانا ظفر علی خاں کے نام بھی امان اللہ خاں کے خطوط تھے۔ سی آئی ڈی نے ایک ذمہ دار ایڈیٹر کو گانٹھا - اور قلیل معاوضہ دے کر وہ خطوط حاصل کر لئے۔

ریاض خیر آبادی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خمریات کے شاعر تھے۔ لیکن خمریات کے مزاجدان نہیں تھے۔ انہوں نے عمر بھر شراب کا ایک قطرہ نہ چکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شراب کا ذکر ہے شراب کا سرور نہیں مرتضیٰ احمد بھی تخلص ہی کے گنہگار تھے۔ خدا معلوم کس نسبت یا رعایت سے انہوں نے اپنا تخلص میکش کیا میکدہ دیکھا نہ پیالہ اُٹھایا۔ ان کی شاعری میں تو پیمانہ و سبو کا بھی ذکر نہیں۔ سگریٹ ضرور پیتے تھے بلکہ اس زمانہ کے تقریباً سبھی بڑے ایڈیٹر بلا کے حقہ نوش یا سگریٹ کش تھے۔ میکش بھی زبردست ”حقیٔ“ یا ”محقق“ تھے۔ لیکن کسی خرافات میں شامل نہ تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک مسلمان ہی کا ظاہر و باطن تھا۔ ان کی تمام تحریریں ایک مسلمان کی تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ اپنے سوا شاذ ہی کسی کو مانتے اپنے بہت زیادہ قائل تھے۔

انا ان کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی۔ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے لیکن کسی کی اہانت بھی نہ کرتے اور جہاں تک کسی بڑی شخصیت کی خوبیوں کے اعتراف کا تعلق تھا ان کے ہاں

کوئی بخل نہ تھا - مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ مدتوں زمیندار میں کام کیا - چیف ایڈیٹر بھی رہے - جب مہینوں تنخواہ نہ ملی تو سارے عملہ کے ساتھ علیحدہ ہو گئے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر دفتر زمیندار کے دروازے پر بھوک ہڑتال بھی کی - لیکن مولانا ظفر علی خاں کے احترام میں ہمیشہ پیش پیش رہے - اختلاف کو اختلاف تک رکھا - دشنام نہ بنایا - شہید گنج کا زمانہ تھا مولانا کرم آباد میں نظر بند تھے - احسان کا ظفر علی خاں نمبر نکلا تمام عملہ نے مولانا کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا - آپ نے بھی فارسی میں نظم کہی - آخری شعر تھا

هر آنکه تیغ بگیرد نمے شود غازی
هر آنکه کلک بگیرد ظفر علی نشود

ان کے بعض طویل مقالے بڑے معرکے کی چیز ہیں جس مدلل انداز میں انہوں نے قادیانی مذہب کا پوسٹ مارٹم کیا وہ ان کا عظیم کارنامہ ہے انداز تحریر کے متعلق پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ان کی زبان میں اردو کا لوچ اتنا نہیں تھا جتنا فارسی کا شکوہ اور عربی کی جلالت - ان کے اداریے ان کے افتتاحیئے ان کے مقالے غرض جو کچھ بھی لکھا عربی ٹکسال میں ڈھل کے نکلا - فارسی کا غازہ تحریروں کے اس چہرے کو اور بھی چمکا دیتا تھا -

شہباز ان کا ذاتی اخبار تھا جب تک حالات موافق رہے نکالتے رہے پھر سید واجد علی شاہ کے ھاتھ بیچ ڈالا - تحریک پاکستان میں ملک خضر حیات نے خرید لیا - ظاہر ہے کہ ان کے لئے یونینسٹوں

کا ساتھ دینا مشکل تھا ۔ استعیفیٰ دے کر الگ ہو گئے ۔ فرمایا میں یونینسٹوں کی نوکری نہیں کر سکتا ۔ اور نہ مجھ میں مسلمانوں کے مؤقف سے غداری کرنے کا حوصلہ ہے ۔ نوائے وقت ان دنوں نیا نیا نکلا تھا ۔ حمید نظامی نے ادارت پیش کی ، مانے نہیں کہنے لگے اب گوشہ نشیں ہو کر رہنے کو جی چاھتا ہے ۔ کئی سال اسی حال میں گذار دیئے ۔ پھر یکا یک جانے کیا خیال آیا کہ "مغربی پاکستان" کی ایڈیٹری قبول کر لی ۔ "نوائے پاکستان" میں چلے گئے ۔ یہ دونو پرچے ان سے بہت چھوٹے تھے مگر انہوں نے اپنے قلم کی آرزو پر اپنے آپ کو ان میں ضم کر دیا ۔

ان اخباروں سے جی اچاٹ ہوا تو پھر گوشہ نشیں ہو گئے ۔ ختم نبوت کی تحریک میں چھلانگ لگائی اور اپنا مقدمہ نہایت پامردی سے لڑا اس سے فارغ ہو کر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انسائیکلوپیڈیا میں اصطلاحات کا ترجمہ کرنے لگے اس سلسلہ میں بعض نہایت قیمتی مقالے لکھے بیشتر پیچیدہ الفاظ و اصطلاحات کا ترجمہ بھی کیا ان اصطلاحات پر ایک فاضل دوست نے نام چھپا کر بعض تنقیدی مقالات سپرد قلم کئے ۔ چٹان کے علم میں نہ تھا کہ ان میں سے بعض اصطلاحات مرتضیٰ احمد خاں کے قلم سے ہیں ۔ جب ان کی نگاہ سے یہ تنقید گزری تو فون کیا حتیٰ کہ غریب خانہ پر تشریف لائے وہ بادشاہوں کے ھاں جانے والے نہیں تھے میں ان کے خوردوں میں تھا ۔ اس قسم کا معاملہ ہو تو غصہ میں مسکراہٹ ہوتی ۔ یہ مسکراہٹ یہاں بھی موجود تھی ۔ انہوں نے پس منظر

بیان کیا کہ تنقیدی مقالہ کیوں لکھا گیا ہے ؟ اور جو صاحب اس کے راقم ہیں ان کی غایت کیا ہے - میں کٹ کٹا کے شرمسار ہو رہا تھا کہ انہیں میرے اخبار کی وجہ سے صدمہ پہنچا ہے بہر حال انہوں نے ایک ادبی نام اختیار کر کے جواب الجواب لکھا کئی قسطوں میں چھپا ابھی یہ مقالہ چل ہی رہا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا - سچ ہے رہے نام اللہ کا -

مرتضی احمد خاں بھلا دینے کی نہیں یاد رکھنے کی چیز تھے - افسوس کہ ہم نے انہیں اتنا بھی یاد نہیں رکھا جتنا کہ چراغاں کے میلہ پر دیہاتیوں کی تانیں اور سربں حافظہ میں رہ جاتی ہیں - اللہم اغفر لہ -

---

اظہر امرتسری

اظہر امرتسری کا نام تو بہت پہلے سنا تھا - لیکن دیکھا انہیں
شہید گنج کی تحریک کے دنوں میں جب وہ نظر بندی سے رہا ہو کے
لاہور آئے تھے - اور دفتر زمیندار میں ٹھہرے ہوئے تھے -
شکل و صورت کے اعتبار سے شاعر ادیب صحافی یا خطیب کچھ
نظر نہ آتے تھے - چہرہ مہرہ واجبی ہی تھا - گہرا گندمی رنگ
میانہ قد اکہرا بدن لمبی ناک آنکھوں میں سگریٹ اور حقے کے
دھوئیں کی جمی ہوئی تہ ، خشخشی ڈاڑھی مونچھوں میں عمر بھر
اُتار چڑھاؤ آتے رہے یعنی کبھی زاویہ قائمہ بناتی ہوئیں کبھی بالکل ہی
غائب کبھی چھوٹی بحر میں اور کبھی برائے وزن بیت ، دانتوں میں

کھڑکیاں لیکن نشوں کی سیاہ رنگت سے داغدار آواز میں خرخرا پن
حسن صورت مجروح ہو گیا تھا چال ڈھال سے لے کر حال و قال
تک کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے گمان ہو کہ اس پیکر خاکی
میں کوئی صاحب قلم ہے ۔ آبائی پیشہ دباغت تھا ۔ امرتسر میں
کب تک رہے اور کہاں رہے ؟ شاید ہی کوئی جانتا ہو لاہور
آنے سے پہلے راولپنڈی میں تھے ۔ وہیں ان کا مکان تھا ۔ ان کے والد
وہیں گھوڑوں کی زینیں تیار کرتے تھے ۔ باقاعدہ تعلیم بالکل نہ تھی
پڑھنا لکھنا کہاں سیکھا اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہیں لیکن اردو
ادب و شعر میں انہیں اُستادانہ دستگاہ ہو گئی تھی ۔ فارسی میں
ملکۂ وافر تھا ۔ عربی کی بھی شد بد رکھتے تھے ۔ البتہ انگریزی
سے قطعی بے بہرہ تھے ۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں ان کا
کلام مقتدر روزناموں مثلاً زمیندار احسان اور انقلاب کے علاوہ
ماہنامہ عالمگیر میں التزاماً چھپتا تھا عالمگیر اس زمانے میں ایک
مؤقر ماہنامہ سمجھا جاتا تھا ۔ احرار نے تحریک کشمیر جاری کی
تو اظہر راولپنڈی محاذ کے انچارج تھے کئی برس احرار میں رہے
شہید گنج کی تحریک میں الگ ہو گئے ۔ حتیٰ کہ راولپنڈی میں
مولانا محمد اسحاق مانسہروی (علیہ الرحمۃ) کی معیت میں احرار کو
اٹھا کر ایسا پٹخا کہ وہاں ان کا چراغ ہی گل ہو گیا ۔

شہید گنج کی تحریک میں زمیندار غیر معین عرصہ کے لئے
بند ہو گیا ۔ سال سوا سال بعد جب نظر بند رہا ہونے لگے اور مولانا
ظفر علی خان رح بھی کرم آباد سے چھوٹ کر لاہور آ گئے تو

مولانا نے اظہر صاحب کو لاہور ہی میں روک لیا زمیندار کا نائب
مدیر مقرر کیا مجلس اتحاد ملت کی نشاۃ ثانیہ ہوئی تو سیکرٹری بنا
دیا ۔ غرض یہ دوہری ذمہ داریاں تھیں جو اُن کے سپرد کی گئیں
ان کے لئے یہ ایک بڑا اعزاز تھا ۔ کچھ دنوں بعد جب ملک
نصر اللہ خان عزیز زمیندار سے الگ ہو گئے تو چیف ایڈیٹری کی
دستار انہی کے سر باندھی گئی ۔ لیکن جو سلوک ہمارے شاعر،
شیخ کی دستار سے کرتے ہیں قریب وہی سلوک اظہر نے اپنے
اعزاز یا دستار سے کیا ۔ بیس سال کی مدت تھوڑی نہیں ہوتی وہ اتنا
عرصہ زمیندار میں رہے لیکن کوئی خوبصورت نقش نہ بنا سکے ۔
الا کہ زمیندار اعلا سے بالا ہو گیا ۔ اشاعت بڑھ گئی وجاہت گھٹ
گئی ۔ ان کا دور زمیندار کا آخری دور تھا ۔ وہ اس اقلیم کے آخری
" فرمانروا " تھے ۔ ان کے بعد کوئی سا جانشین بھی فرمانروا
کہلانے کا مستحق نہ رہا ۔ حتیٰ کہ زمیندار ہی غفرلہ ہو گیا ۔

اظہر بنیادی طور پر شاعر تھے ۔ غزل بھی کہتے اور اس میں
تیر و نشتر قسم کے شعر بھی کہہ جاتے مگر نظم کہنے میں خاص مہارت
تھی با لخصوص اخباری نظمیں ، جو روزمرہ کے واقعات سے قلم کی نوک
پر بالبداہت آ جاتی ہیں ان کے ہاں تخیل اور گہرائی سے زیادہ جذبہ
اور الفاظ تھے ۔ انہیں صحافی نہ ہونا چاہیئے تھا ۔ لیکن صحافی ہو
گئے تھے ۔ اصلاً وہ الفاظ کے صناع تھے عروض خوب جانتے اور شاعری
میں ٹھوکر نہیں کھاتے تھے نثر میں البتہ کبھی کبھار چوکڑی

بھول جاتے ان کے اداریہ الفاظ کی مینا کاری ہوتے وہ دماغی اعتبار
سے جنگ عظیم سے پہلے کی اخبارنویسی کے کھلاڑی تھے - قلم
سے ورزش کرتے الفاظ سے ڈنڈ پیلتے اور جذبات سے کشتی لڑتے
تھے تمام زندگی مجرد رہے عقد نہ کیا ممکن ہے کوئی بی بی ان سے
نکاح کر لیتی لیکن وہ ذہناً شادی کے تصور سے دستبردار ہو چکے
تھے شراب نے اُنہیں تباہ کر دیا تنخواہ معقول تھی مولانا اختر علی
خان حسب منشاء تحریروں پر انعام و اکرام دینے میں بڑے سخی
تھے جس سے ایک اچھا خاصہ مشاہرہ بن جاتا خوبی ان میں یہ تھی
کہ اپنے عزیزوں کا التزاماً ہاتھ بٹاتے خرابی یہ تھی کہ خاصی رقم
شراب کی بھینٹ ہو جاتی اس شراب ہی نے انہیں ڈبویا ایک آنکھ
ضائع ہو گئی شراب نہ ملے تو سپرٹ پی لیتے، پی کے اتنا مست
ہوتے کہ ہوش و حواس اڑ جاتے لنڈا بازار کے کلالوں سے شراب
خریدی کھڑے کھڑے غٹا غٹ بوتل چڑھا گئے اور دیواروں سے
باتیں کرنے لگے یہ ان کا معمول تھا آخری دنوں میں یہ حال ہو
گیا تھا کہ نشہ میں دھت بجلی کے کھمبوں سے "راز و نیاز" کر
رہے ہیں کھمبے سے کہتے ہیں، ہٹ جاؤ - کھمبا ہٹتا ہے نہ راستہ
دیتا ہے - آخر احتجاجاً خود ہی ہٹ جاتے عام لوگ دیوانہ سمجھ
کر پاس سے گذر جاتے کھانے پینے کی انہیں مطلقاً سدھ نہ تھی جو
ملا جیسا ملا کھا لیا - سالن میں میلی کچیلی انگلیاں بھگو کر مرچ
مسالہ تیز کر لیتے - ہفتہ میں ایک آدھ دن ہی نہاتے ادارت کی میز
پر سکندر ہوتے کوچہ و بازار میں قلندر، ان کے قلم سے بہت سوں

کو صدمہ پہنچا ہوگا لیکن زمیندار سے باہر کسی کے لئے مضر نہ تھے ہر شخص کے ساتھ مخلص رہنے کی کوشش کرتے کسی شخص کے نقصان میں بھی راضی نہ تھے ـ

زمیندار کی منشاء اور مصلحت کو بخوبی سمجھتے اور مالک کی نگاہ سے اس کے دل کا مدعا پا جاتے تھے اللہ بخشے مولانا اختر علی خاں باغ و بہار انسان تھے لیکن طبیعت سیمابی لے کر آئے تھے وہ کوئی خطرہ بھی مول لینا نہیں جانتے تھے ـ اظہر نے اپنے آپ کو ان کی منشاء و مرضی کے سانچہ میں ڈھال لیا تھا ـ انہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ یہ لکھو یا وہ ـ مولانا اختر علی خاں کے چہرے مہرے ہی سے بھانپ لیتے تھے کہ اداریہ اس عنوان پر ہونا چاہیئے ـ زمیندار ان کے عہد میں ثقہ نہیں رہا بلکہ عملاً تجارتی ہو گیا تھا ـ اپنے اس عروج کو سنبھال کے رکھتا تو آج سب سے بڑا اخبار ہوتا کس مپرسی کا شکار نہ ہوتا ادھر مولانا ظفر علی خاں کا سایہ اٹھ گیا ادھر حالات نے آنکھیں پھیر لیں واقعات نے پلٹا کھایا اظہر کی سناونی آ گئی اختر علی خاں بے حوصلہ ہو گئے زمیندار رانڈ ہو گیا بڑھاپے میں عصا ٹوٹ گیا وقت نے طوطا چشمی کی ـ جس اخبار کی روایات اتنی شاندار تھیں وہ مرگھٹ کی آگ ہو کر بجھ گیا ـ

اظہر کی موت بڑے ہی المناک حالات میں ہوئی ـ ایک روز اتنی پی لی کہ چت ہو گئے ـ قیمتی شراب ان کے مقدر میں نہ تھی ـ ٹھرا پیتے یا سپرٹ ، ساتھی کوئی تھا نہیں تنہا پیتے ، چوری پیتے ، اور لگا تار پیتے کوئی یار و آشنا نہ تھا ـ

ایک عیسائی لڑکا کسی وجہ سے مسلمان ہوگیا - پھر جانے کیا سوجھی کہ دولتانہ کہلانے لگا - اظہر صاحب نے اس کو دل اور گھر دونو میں بسا لیا وہ ان کی رحلت تک ساتھ رہا - عام تاثر یہ تھا کہ ان کا بھتیجا ہے لیکن جب اظہر صاحب اٹھ گئے تو اس نے اٹھائی گیری شروع کردی - آخر چھ ماہ کے اندر اندر خود کشی کر کے لقمۂ اجل ہوگیا -

اظہر کا مجموعہ کلام مرتب ہو سکتا ہے - لیکن کوئی شخص نہیں جو ان اشعار کو جمع کرے - ان کی دو کتابیں ''خونیں تحریکیں'' اور '' دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل '' عالمگیر بکڈپو نے شائع کی تھیں اب کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں ان کے مطالعہ سے اظہر صاحب کی تاریخ آشنائی کا اندازہ ہوتا ہے -

ادیب اور شاعر تو شراب سے مرا ہی کرتے تھے - لیکن اس دور میں بعض نامور صحافی بھی اسی کی نذر ہو گئے - پنجاب کے پرانے اور کہنہ مشق اخبار نویسوں کا یہ حال تھا کہ ان میں ٹاواں ٹاواں شخص ہی شراب پیتا تھا - تقریباً سبھی صوفی صافی تھے - پینتیس برس پہلے زمیندار میں قاضی احسان اللہ چیف ایڈیٹر تھے - وہ شراب کے ہاتھوں قبر میں چلے گئے - ''سیاست'' میں خان محمد اسحاق خاں علیگ مدیر اعلیٰ تھے ان کا حال یہ تھا کہ چوبیس گھنٹہ شراب میں دھت رہتے - رمضان میں روزے رکھتے لیکن کھولتے شراب سے -

۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر انصاری مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کی صدارت کرنے

کے لئے لاہور آئے تو حقوقیئے مسلمانوں نے سیاہ جھنڈیوں سے ان کا استقبال کیا خان محمد اسحاق بھی ان مظاہرین میں شامل تھے شراب کی بوتل ہاتھ میں لئے غل مچا رہے تھے '' اس لئے پیتا ہوں کہ گاندھی شراب سے منع کرتا ہے اور کانگرس نے شراب کی دکانوں پر پکٹنگ لگا رکھی ہے'' آخر یہ بندہ خدا بھی شراب ہی کے ہاتھوں مارا گیا ۔ پاکستان بنا تو شراب نوشی بعض نامور جرنلسٹوں کا روزمرہ ہوگئی ۔ مثلاً مجید لاہوری اس کا شکار ہؤا ۔ چراغ حسن حسرت پر یہی بجلی گری ۔ ایوب کرمانی نے اس سے عاجز آکر خودکشی کی ۔ اور اب تو ایڈیٹروں اور ان کے ہمراہیوں کی آدھی کھیپ شراب کی رسیا ہے جب تک پیالہ اور نوالہ بلکہ معشوق چہاردہ سالہ شریک ادارت نہ ہو اس وقت تک اخبار معنوی اور صوری لحاظ سے مکمل نہیں ہوتا ہے ۔

اظہر ان ایڈیٹروں میں سے نہیں تھے جو دماغوں کی تربیت کرتے ہیں وہ ان اہل قلم میں سے تھے جو قارئین کے جذبات کی تصویریں کھینچتے ہیں ان کا پیشہ ورکنگ جرنلسٹ کا تھا ۔ لیکن معناً وہ ورکنگ جرنلسٹ نہیں تھے انہوں نے اخبار نویسی کی عادت ڈالی تھی ۔ پھر ان کی یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ اسی کے ہو گئے ۔ ان میں اتنا بوتا نہ تھا کہ سینائے صحافت پر رب ارنی کہہ سکیں کیونکہ ان میں لن ترانی سننے کا حوصلہ نہ تھا لیکن وہ زمیندار کے اشاعتی عروج کی یادگار تھے ایک زمانہ تھا جب زمیندار اپنے ایڈیٹروں کی وجہ سے معروف تھا ۔ اظہر اس زمانے کے ایڈیٹر تھے جب ایڈیٹر زمیندار کی وجہ سے متعارف ہوتے تھے ۔

بعض آدمیوں کی موت وقت پر ہوتی ہے بعض کی بے وقت۔
اظہر کی موت وقت پر ہوئی نہ بے وقت وہ ایک عرصہ سے موت کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے آخر موت نے ہاتھ بڑھایا اور اٹھا لیا غرض موت نے انہیں انتخاب نہیں کیا خود انہوں نے اپنے لئے موت کو انتخاب کیا تھا۔

حاجی لق لق

حاجی لق لق پنجاب کی حاضر جواب قوم کے فرد تھے - قدرت نے انہیں سماجی طور پر کمزور رکھا لیکن ذہنی طور پر مالا مال کر دیا تھا - پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہو کر عراق چلے گئے - وہاں کلرک سے حوالدار کلرک ہو گئے - جنگ ختم ہوئی تو ایک عراقی خاتون سے شادی کر کے وہیں ٹک گئے - مدۃ العمر خط نہ لکھا تو والدہ عراق پہنچ گئیں اور بہ اصرار پٹی واپس لے آئیں - جو ان کا مولد و مسکن تھا بغداد میں کئی سال رہے اُردو گھر میں سیکھی تھی یا گلستان بوستان پڑھ کے فارسی میں اُتارو ہو گئے تھے - عراق جاتے جاتے بحری جہاز میں انگریزی سیکھنا شروع کی اور سال بھر میں کہیں سے کہیں نکل گئے - فر فر بولتے دما دم لکھتے سواد خط اتنا عمدہ

کہ رشک آتا قیام بغداد کے زمانہ میں عربی سیکھی عراقی اہلیہ نے
مادری زبان بنا دی ان کے لئے عربی بولنا عربی لکھنا اور عربی سے
اردو میں ترجمہ کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ماں کی گود میں صرف
عطا محمد تھے مولانا نواب دین رمداسی کی بدولت چشتی ہو گئے۔
مولانا علیہ الرحمۃ بڑے اچھے واعظ اور صاحب دل صوفی تھے۔
کوہستان کے مظہر الدین رمداسی اُن کے فرزند اور نسیم حجازی داماد
ہیں حفیظ جالندھری کے سن شعور کا آغاز تھا گلا نورانی پایا تھا۔
شاعری بھی کر لیتے تھے مولانا نے وعظوں میں ساتھ کر لیا پٹی
میں عطا محمد چشتی سے حفیظ کی دوستی ہو گئی عطا محمد بھی خوش
آواز تھا گلے میں بلا کا رس تھا دونوں نے مل کر قوالی شروع کی
مولانا رمداسی سماع کے رسیا تھے ہی، دونو ان کی نگاہ میں بس گئے۔
ان کا تیسرا ساتھی عبدالمجید قرشی تھا جو بعد میں سیرت کمیٹی کا ناظم
اور ایمان کا ایڈیٹر بنا تینوں نے ایک سا مذاق پایا تھا آپس میں
پینچ لڑاتے ایک دوسرے کے پتنگ کی کنی کاٹتے اور بتکدوں میں
آہوؤں کو رام کرتے تھے۔

عطا محمد چشتی ابوالعلا چشتی کیونکر بنا۔ اس بارے میں کچھ
کہنا مشکل ہے۔ البتہ حفیظ جالندھری اس سے پہلے ضرور ابوالاثر ہو
گئے۔ اس زمانہ میں نیرنگ خیال، ملک کا مشہور ترین ماہنامہ تھا اور
تمام ہندوستان میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ اس میں چھپنا کسی
اہل قلم کے مستند ہونے کی دلیل تھا ابوالعلا چشتی کا پہلا افسانہ
اسی میں چھپا اور یہ افسانہ اِنہوں نے بغداد سے لکھا تھا۔ پھر اچانک

اڑتی اڑاتی خبر آ گئی کہ ابوالعلاء عطا محمد چشتی لاہور آ گئے ہیں۔ اور تاج کمپنی کے ادبی ماہنامہ تاج کی ادارت ان کے سپرد ہوئی ہے اس سے پہلے ہفتہ وار ایمان میں رہے "مساوات" امرتسر کے ادارہ میں کام کیا۔ حقیقی جوہر ان کا زمیندار ہی میں کھلا ابتداً عربی کے تراجم کرتے رہے پھر افسانہ نویسی کی اچانک ابوالعلا غائب ہو گیا۔ لق لق آ گیا حاجی اس سونے کا سہاگہ تھا۔ زمیندار میں فکا ہی نظموں کا آغاز کیا ادب لطیف کے مقابلہ میں ادب کثیف کی طرح ڈالی مزاح ان کی گھٹی میں پڑا تھا پھبتی کسنا خون میں، ضلع جگت میں استاد تھے۔ طنز بھر پور کرتے طعن توڑتے وقت بے قابو نہ ہوتے بذلہ ھاتھ کی چھڑی تھا مطائبات جیب کی گھڑی، احسان میں خوب چمکے ماڈرن غزلوں کی اختراع سے شہرت عام ہو گئی۔ احسان چھوڑا تو کچھ دنوں شہباز میں قیام کیا۔ پھر زمیندار میں آ گئے۔ ہمیشہ کے لئے اسی کے ہو گئے۔ اور مرتے دم تک اسی کے رہے لیکن ان کی قابلیتوں کو جلد ہی گھن لگنا شروع ہوگیا جس شراب کو عراق سے ساتھ لائے تھے وہ تریاق سے بھی نہ چھوٹی۔ وہ اور شراب گویا توام ہو گئے۔ زمیندار کا یہ دور لطیفہ سے کم نہ تھا۔ اس کے اداریوں میں شراب کے خلاف التزاماً احتجاج کیا جاتا تقریباً روز ہی لکھا ہوتا کہ پاکستان جیسی سب سے بڑی اسلامی مملکت میں شراب خانہ خراب کی بکری اوامر الٰہی کی اہانت کے مترادف ہے لیکن اس کے دونو ایڈیٹر اظہر امرتسری اور حاجی لق لق جب تک شراب نہ پی لیتے ان کا سکون مضمحل رہتا دونو کے خون میں شراب رچی ہوئی تھی

وہ شراب کے بغیر جی ہی نہ سکتے تھے - لق لق کا یہ حال ہو گیا
تھا کہ وہ شراب ہی کا چربہ رہ گئے تھے - ایک کے بعد دوسرا مرض
انہیں دبوچتا رہا - شراب نے عجمی ذوق سے سازش کر کے انہیں
گونا گوں عوارض کی ڈھولی بنا دیا تھا - سماعت میں ثقل اور بینائی
میں فرق آ گیا - معلوم ہوتا تھا انسانی جسم نہیں شراب کی خالی
بوتل ہے - یکے بعد دیگرے چار آدمیوں نے اس زمانے میں اپنے آپ
کو ہلاک کیا - اختر شیرانی ، سعادت حسن منٹو ، اظہر امرتسری
اور حاجی لق لق - شراب نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسبیاں
عفت سے کرتی ہیں - اختر شیرانی کے ساتھ ان کا فن نہ ہوتا تو
راہگیروں کے قہقہے اُنہیں نگل جاتے - سعادت حسن منٹو جواں مرگ
ہو گیا - شراب نے ایسی پٹخنی دی کہ سنبھالا لینا مشکل ہو گیا -
اظہر شراب کی بھٹی میں کوئلہ ہو گئے حاجی لق لق نے قلم کو
کشکول بنا لیا فکاہات میں جس کا تذکرہ کرتے اسی شام اس سے
پاؤ بھر شراب یا اس کی قیمت وصول کرتے - اس معاملہ میں ادھار
کرنا نہیں جانتے تھے - شیخ عبدالمالک (مالو شو) عطا محمد بٹ
(تمباکو والے) اور سیٹھ آدم جی (پبلشر) ان تینوں کا ذکر فکاہات
میں ضرور کرتے - عمر کے آخری دور میں ، موت سے کوئی سال دو
سال پہلے شراپ و کباب دونوں سے ہاتھ اٹھا لیا لیکن تیر کمان سے
نکل چکا تھا - رندی و سر مستی نے وہ خنجر زنی کی کہ اعضاء کو
توڑ کے رکھ دیا - گمان یہ تھا کہ جی نہیں رہے بہ قول جوش جینے
کی نقل کر رہے ہیں - رنگ روپ اول تھا ہی نہیں ، اور اگر کسی

وقت تھا تو اڑ چکا تھا ۔ یوں کہیئے کہ چودھری شہاب الدین کے
بروز تھے ۔ عموماً سوٹ پہنتے گاہے ماہے اچکن کوئی سا لباس انہیں
پھبتا نہیں تھا ان کے قلم میں تفنن تھا گفتگو میں نہیں، تھے کم گو ۔
البتہ طبیعت کسی موضوع میں بھی بند نہ تھی گلستان کے باب پنجم
کی محفل ہوتی تو گلفشانیٔ گفتار کا میدان انہی کے ہاتھ ہوتا ۔ خدا
سے بہت ڈرتے ۔ اپنی تمام لغزشوں اور معصیتوں کے باوجود قلباً مسلمان
تھے ۔ یہ احساس انہیں آخر تک رہا کہ افلاس سے بڑی کوئی لعنت
نہیں قدرت سے بھی شاکی تھے ۔ اور خود سے بھی قدرت سے اس لئے
شاکی تھے کہ اس طرح جینا ایک مہلک فرض تھا ۔ اور خود سے
اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دماغی نعمتیں عطا کی تھیں انہیں اس
طرح ضائع ہوتے دیکھ کر پریشان رہتے ۔

دوسری جنگ عظیم سے قبل مسلمانوں میں اردو اخبار نویسی
ایک درویشی سلسلہ تھا ۔ اکثر و بیشتر فتوحات پر گذارہ ہوتا ۔ قلم
کے دھنی فقر و فاقہ کی مار کھا کھا کے جیتے تھے ۔ حاجی لق لق بھی
انہیں فقراء میں سے تھے ۔ اخبار نویسی میں وہ کسی ہمعصر سے ہیٹے
نہیں تھے ۔ لیکن ان کے قلم سے ایسی چیزیں کم ہی نکلی ہیں جنہیں
ہم ادب میں جگہ دے سکیں ۔ ان کے رشحات قلم میں بولیاں زیادہ
ہیں گیت کم ۔ تحریر میں خاصی توانائی تھی ۔ اعلیٰ ادب پیدا کر
سکتے تھے ۔ لیکن انہوں نے عادتوں کے لئے لکھا اور نفس کے لئے قلم
اٹھایا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمیندار کے بہرہ ٔ فکاہات کا مدیر لنڈا بازار
کے ناشروں کی مطبوعات کا مصنف ہو کے رہ گیا اس طناز صحافی نے زندگی

کے آخری دنوں کو جس بری طرح بسر کیا ان کا تصور بھی ہولناک ہے - زمیندار کے دم واپسین میں آٹھ آنے یومیہ پر فکاہات لکھتے منصور علی خاں سالم روپے کا وعدہ کرتے تو اداریہ بھی گھسیٹ دیتے اور جب کسی دن یہ وعدہ دوشیزہ کی کہہ مکرنی ہو جاتا تو لاٹھی ٹیکتے ہوئے دوستوں کے دروازے پر دستک دینے چلے جاتے "آواز آتی کہ صاحب خانہ گھر میں نہیں ہیں - ھانپتے کانپتے واپس آجاتے - جن دنوں مرض الموت نے حملہ کیا لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے تھے - ہفتہ عشرہ میں کام تمام ہوگیا - عجیب واقعہ ہے کہ نامور صحافیوں میں سے بیشتر کا جنازہ اس طرح اُٹھا جیسے کوئی راہگیر مارا گیا ہو - خود مولانا ظفر علی خاں نے کس مپرسی میں دم توڑا - اختر علی خاں لاہور ہسپتال میں وفات پاگئے - جنازہ ایمبولنس میں کرم آباد گیا - وہاں گنتی کے چند لوگوں نے دفنا دیا - اظہر امرتسری پر یہی بیتی - کسی ہم عصر نے کندھا نہ دیا - (الا ماشاءاللہ) ابو سعید بزمی احسان کے ایڈیٹر تھے - امریکہ میں وفات پاگئے - امریکنوں نے لاش لاہور بھجوا دی - لاہور کے ایئرپورٹ پر امریکی دفتر کے اہل کار تو موجود تھے اپنے ھاں کا ایک صحافی بھی نہ تھا -

لق لق کا گھر کہاں ہے ؟ موت کی خبر سن کر راقم التحریر اور حمید نظامی ڈھونڈتے پھرے - بڑی مشکل سے پتہ چلا کہ مصری شاہ کے آخری حصہ میں رہتے ہیں - پہنچ کر دیکھا تو بول و براز کی ڈھیریوں کے ایک طرف ان کا مکان تھا - حمید نظامی اہل قلم کے جنازے میں دوست ہو یا دشمن ضرور شریک ہوتے تھے -

لق لق کے مکان پر پہنچے تو بول و براز سے دماغ پھٹا جا رہا تھا
الٹے پاؤں واپس آگئے - آس پاس کسی کو خبر تک نہ تھی کہ یہاں
کوئی لق لق رہتا تھا اور آج مر گیا ہے نہ کوئی نالہ ماتم ہی اُٹھ
رہا تھا - ایک صاحب اندر سے نکلے - علیک سلیک ہوئی - دریافت
کرنے پر معلوم ہوا کہ مرحوم کے بھائی عبداللہ اثری کفنانے دفنانے
کی فکر میں بازار گئے ہیں - بعض عزیزوں کے باہر سے آنے کا امکان
ہے - پانچ بجے شام جنازہ اُٹھے گا -

اگلی صبح اخبارات کے ایک کونے میں خبر چھپی ہوئی تھی
کہ حاجی لق لق کو کل چھ بجے شام "بدھو کے آوا" میں دفنا دیا گیا
مرحوم کئی ہفتوں سے بیمار تھے - کسی علاج و دوا سے افاقہ نہ ہوا -
کل صبح اچانک ان کا انتقال ہو گیا - اور وہی پامال مصرع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ابوصالح اصلاحی

عبدالمجید قریشی نے کہا "شورش صاحب ان سے ملئے - یہ ہیں ابو صالح اصلاحی - انہی کے مقالہ پر آپ نے ادارتی نوٹ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر فکر و نظر کی راہیں کھول رکھی ہیں - زیر نظر مقالہ ان کے وسیع مشاہدہ عمیق مطالعہ اور طویل تجربہ کا نتیجہ ہے ——— !"

ابو صالح اصلاحی ——— ؟

میں نے مصافحہ تو گرمجوشی سے کیا بلکہ دائیں بازو سے ان کی گردن پر قوس بناتے ہوئے معانقہ کی گرہ بھی لگائی مگر مجھے یقین نہ آیا کہ یہی ابوصالح اصلاحی ہیں اول تو ان کے نام کی رعایت سے ایک معمر انسان کا تصور بندھتا تھا دوم جو کچھ ان کے قلم سے

نکلا سواد خط کی پختگی سے لے کر خیالات کی گھلاوٹ تک - یہ تسلیم
کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہوئی کہ بالی عمریا کا یہ نوجوان ہی
ابو صالح اصلاحی ہے اُس وقت یہی کوئی بیس اکیس برس کے
پیٹے میں تھے - لیکن چہرے مہرے سے سولہ سترہ برس کے نظر آ
رہے تھے - نازک سا جسم تھا - آنکھیں متحرک بھی تھیں اور شوخ
بھی - رنگ صاف تھا - چہرہ گول مٹول زبان قینچی - چال ڈھال
میں سوج خرام یار کی آمیزش - اور یہ تھا ان سے دوستی کا آغاز -

زمانہ گذرتا گیا دوستی گہری ہوتی گئی اخبار نویسی ابوصالح نے
تسنیم سے شروع کی - چٹان میں چار پانچ برس لکھتے رہے - ''قلم قتلے''
ان کا خاص کالم تھا انھی کے ذہن کی اختراع ، ہلکا پھلکا طنز کرتے
افراد و اشخاص کو شاذ ہی چھیڑتے خبروں کا پوسٹ مارٹم کرتے
یا ایسے نظریوں کو مطائبات کی سان پر کستے جو ان کے نزدیک
مضحک ہوتے وہ کبھی اوچھا وار نہ کرتے - جو کچھ لکھتے صاف
ستھرا لکھتے انہیں مطائبات کے مزاج کا تمام و کمال اندازہ تھا خوب
سمجھتے تھے کہ قلم کہاں زخم بنتا اور کہاں پھول کھلاتا ہے -
قلم قتلے سے نہ صرف ان کے قلم کا حسن بڑھا بلکہ ایک اسلوب
بن گیا -

کوہستان نکلا تو اس کے ایڈیٹر ہو کر راولپنڈی چلے گئے -
قلم قتلے کی جگہ ''آج کی باتیں'' لکھنا شروع کیں - مشرق میں آ
گئے تو عنوان ساتھ لے آئے - غرض ان روزناموں میں ان کا جوہر
مکمل ہوتا گیا حتیٰ کہ مکمل ایڈیٹر ہو گئے جس پر چوٹ کرتے

وہ خود محسوس کرتا کہ لطائف الادب میں سے کوئی چیز ہو گئی ہے - مزاح دشنام نہیں اور نہ مسخرا پن ہے مزاح کی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ جس شخص کے آپ چٹکی لے رہے ہیں وہ خود لذت اندوز ہو - تلخی یا ترشی اتنی ہونی چاہیئے جتنی ہلکے ہلکے بخار کا سرور ہوتا ہے ابو صالح مزاح کی ان نزاکتوں اور اداؤں سے بخوبی واقف تھے - ان کی تربیت ہی اس طرح ہوئی تھی کہ تحریر میں درشتی کے عادی نہ تھے گفتگو کے انداز میں لکھتے قلم برداشتہ لکھتے اور جو لکھتے ناپ تول کر لکھتے الفاظ کے اسراف اور فقروں کی تبذیر سے ان کی تحریریں بچ کے نکلتی تھیں میرا ان کا ساتھ ۱۹۴۸ء کے اواخر سے تھا - تمام عمر گاڑھی چھنتی رہی کوہستان کے زمانہ میں راولپنڈی چلے گئے تو صبح و شام کی یک جائی میں فرق آ گیا - ورنہ اس سے پہلے ان کا معمول تھا کہ گھر سے ناشتہ کر کے صبح ہی دفتر چٹان میں چلے آتے اور شام سات آٹھ بجے تک ساتھ رہتے - ہمارا کھانا پینا ان دنوں اکٹھا ہی تھا - دوپہر کو نظامی صاحب کے ساتھ کافی ھاؤس میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزارتے شام کو لورینگ میٹرو یا کسینو میں ! حمید نظامی کے اس حلقہ احباب میں تین آدمی باتونی (Talktive) تھے - شیخ خورشید احمد (سابق وزیر قانون حکومت پاکستان) جنہیں ہم ازراہ سخن گستری ''بلبل لبستان معانی'' کہتے شورش کاشمیری اور ابو صالح اصلاحی !

شیخ صاحب چونچیں لڑانے میں یکتا تھے - ابو صالح عموماً سیاسیات پر بحثیں کرتے کبھی کبھار ہلکا پھلکا مزاح بھی جب وہ مستقل طور پر

راولپنڈی میں رہنے لگے تو قدرتاً لاہور سے روز مرہ کا تعلق چھوٹ گیا۔ لیکن جب کبھی دوسرے تیسرے مہینے لاہور آتے تو چوپال لگتی نہ وہ ملے بغیر جا سکتے تھے نہ ہم ان سے ملے بغیر راولپنڈی جا کر واپس آتے۔ تعلقات ان کے اور لوگوں کے ساتھ بھی تھے لیکن یار باش ہمارے ہی تھے عیب ان کا ہمارے نزدیک ایک ہی تھا کہ پان کھاتے تھے دھبہ ان کے دامن پر کوئی نہ تھا۔ کھرا سونا تھے صاف ستھری جوانی، چمکتا دمکتا شباب، نفس کی سرکشی سے نفور، دل، آئینہ جو کچھ دیکھتے یا پڑھتے اسی پر سوچتے۔ ہم لوگ ہر کوچہ سے ہو آئے اور کسی قدر ہم میں عشق کا تیکھا پن بھی تھا۔ ابو صالح صرف کتابوں کے شیدائی تھے۔ ان کے نزدیک حسن و عشق کے معاملات صرف غزل کے مضامین تھے۔ وہ انہیں شاید انسانوں کے برتنے کی چیز ہی نہ سمجھتے تھے۔ تحریروں میں تو ان کی حسن پایا جاتا تھا لیکن چال ڈھال میں بالکل ہی کورے تھے۔ انہیں قطعی احساس حسن نہیں تھا اور نہ ان کے اندر شاعرانہ قسم کا کوئی ولولہ تھا۔ ''جوانی چنانکہ اُفتہ دانی'' کا اطلاق اُن پر ہوتا ہی نہیں تھا۔

شہید سہروردی ایک زمانہ میں دن کا بڑا حصہ دفتر چٹان میں گذارتے تھے۔ چونکہ راشش ورنگ کا شوق تھا لہذا اُس بازار میں جاتے ہوئے بھی ہچکچاتے نہ تھے۔ دن بھر کی دماغی مشغولیتوں کے بعد سیر و تفریح ضرور کرتے۔ لیکن ابو صالح ہم میں رچ مچ کر بھی اس کوچہ میں ہمارے ساتھ نہیں رہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں راشش ورنگ اور غنا و سماع سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ''اس بازار میں''

کی تالیف کے زمانہ میں دو چار دفعہ ساتھ گئے لیکن اس سے زیادہ نہیں کہ دوستانہ سفر میں انہیں اس ایک موڑ سے بھی گذرنا پڑا : ہجر و وصال قسم کی چیزوں سے نا آشنا تھے ۔ امریکہ سے واپسی پر دو چار روز کے لئے جرمنی میں قیام کیا ۔ ہم لوگ وہاں انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے پہلے سے موجود تھے ۔ ان ملکوں میں انسان کے برہنہ ہونے میں کیا دیر لگتی ہے لیکن ان کے لئے کسی رخ سے کوئی اٹکاؤ نہ تھا ۔ وہ ہر چیز پر تبصرہ کرتے پانوں کی ڈھولی سے لے کر کینیڈی کی گولی تک ۔ لیکن بے تکلف دوستوں میں بھی بے تکلف موضوعوں کو نہیں چھیڑتے تھے ۔

لاہور سے مشرق نکلا تو اس کے ایڈیٹر ہو گئے ۔ لیکن اب وہ بے تکلف صحبتیں نہیں رہی تھیں ۔ نظامی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے ۔ میں اپنے اشغال میں ڈوب رہا تھا ۔ انہیں روزنامہ کی ادارتی ذمہ داریوں سے فراغت نہ تھی ۔ مشرق نے اخبارات کو ایک نیا ''رنگ و روغن'' دیا ۔ اور وہ صبح و شام کی ریاضت کے بغیر محال تھا ۔ تاہم ملاقات ہر روز ہوتی ۔ کبھی وہ دفتر چٹان میں چلے آتے کبھی میں مشرق کے دفتر میں چلا جاتا ۔ کون سا موضوع ہوگا جس پر ہم نے طبع آزمائی نہ کی ہو ۔ نظامی کی طرح وہ بھی گرد و پیش کی گھٹن کو محسوس کرتے اور ہنسی خوشی میں بہت کچھ کہہ جاتے تھے ۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ اسلامی حکومتیں اسی ڈھب کی ہوتی ہیں مطمئن تو وہ ہمیشہ ہی رہے لیکن اپنی شادی کے بعد بہت

مطمئن ہو گئے تھے ان پر ہر طرح کا زمانہ آیا لیکن ان کی بعض عادتیں سنجھی ہوئی تھیں کہ انہیں قناعت سے بسر کرنے کا ڈھنگ آ گیا تھا - ایک نامور باپ کے ہونہار بیٹے تھے - اپنے والد مولانا امین احسن اصلاحی سے انہوں نے دو چیزیں ورثہ میں پائی تھیں - ایک تمکنت جس میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا - دوسرے قناعت کہ بڑے بڑوں میں نہیں ہوتی - وہ چھوٹی سی عمر ہی میں اس دولت سے بہرہ یاب ہو گئے تھے -

مدرسہ " الاصلاح " سرائے میر سے پڑھ کر نکلے تو ہندوستان تقسیم ہو رہا تھا پاکستان چلے آئے - والد جماعت اسلامی کے نائب صدر تھے - خود بھی جماعت ہی کے ہو گئے - لیکن والد سے بہت پہلے جماعت کو چھوڑ دیا ذہن ہمیشہ اسلامی رہا اس کی وجہ ابتدائی تعلیم و تربیت کے علاوہ والد کا اثر اور گھر کا ماحول تھا اپنے والد کی بے پناہ عزت کرتے - اکثر جرنلسٹوں میں جو چھچھورا پن ہوتا ہے وہ ان میں مطلقاً نہیں تھا بلکہ چھوا تک نہیں تھا - عربی ، فارسی ، اردو انہوں نے مدرسہ میں پڑھی - انگریزی خود سیکھی - حتیٰ کہ پیچیدہ سے پیچیدہ کتابوں کے مطالعہ پر قادر ہو گئے - لکھنا والد سے سیکھا - اور برس دو برس میں مشاق ہو گئے - ان کے ہاں مشکل الفاظ کا گذر ہی نہیں تھا - سیدھے سادے الفاظ میں مافی الضمیر ادا کرتے - اور جو کہنا ہوتا اس خوبی سے بیان کرتے کہ سامع یا قاری کے دل پر نقش ہو جاتا - وہ اپنی کھیپ کے غالباً آخری نوجوان ایڈیٹر تھے جنہیں اردو ، فارسی اور

عربی کا بنیادی علم حاصل تھا اور ان زبانوں کے کلاسیکل لٹریچر سے کما حقہ آگاہ تھے مشرقیت ان کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی ایک لحظہ کے لئے بھی اپنے آپ کو انگریزی تہذیب کے حوالے نہیں کیا بلکہ انگریزی تہذیب کو اپنے حوالے کر لیا تھا۔

قاہرہ جانے کا انہیں کوئی شوق نہیں تھا۔ عمرہ کرنا چاہتے اور اسی شوق میں تیار ہو گئے تھے۔ سٹیٹ بنک والوں نے آخر وقت تک انہیں زر مبادلہ کے انتظار میں رکھا جس روز انہیں موت کے سفر پر روانہ ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے دفتر چٹان میں تشریف لائے اور دیر تک گپ بازی کرتے رہے میں نے کہا صبح ہوائی اڈے پر حاضر ہوں گا۔ کہنے لگے آغا صاحب اس تکلف کی کیا ضرورت ہے ؟ تیسرے روز تو واپس آ رہا ہوں — میری عادت ہے کہ بہت کم لوگوں کو ہوائی اڈے یا ریلوے اسٹیشن پر لینے یا چھوڑنے جاتا ہوں۔ شاید زندگی میں ایک آدھ شخص ہی ایسا ہو۔ لیکن اس روز میرا دل رہ رہ کے آمادہ کرتا رہا کہ ضرور جاؤں۔ چنانچہ گرمی کی شدت کے باوجود وقت کے وقت ہوائی اڈے پر پہنچا وہ پابہ رکاب تھے۔ دیکھتے ہی معانقہ کیا۔

" آغا صاحب آپ نے واقعی تکلف کیا۔"

" نہیں بھائی تکلف کیسا ؟ طبیعت چاہ رہی تھی "

" اترسوں تو واپس آ رہا ہوں۔"

" میاں اس اُڑن کھٹولے کا اعتبار ہی کیا ہے " معانقہ کیا

اور جہاز پر سوار ہونے کے لئے پسینجر روم میں چلے گئے -

الفاظ منہ سے نکل گئے - لیکن اس وقت سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جہاز عزرائیل کے پر لے کر اُڑ رہا ہے - نہ اس کی تقدیر میں واپسی ہے اور نہ اس کے مسافروں کی - اگلے دن صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ مجید نظامی نے فون کیا کہ پی آئی اے کا وہ طیارہ جو صحافیوں کو لے کر قاہرہ گیا تھا آج قاہرہ کے نزدیک گر کر تباہ ہو گیا ہے انا للہ و انا الیہ راجعون - سبھی لقمۂ اجل ہو گئے - ان کی تصویریں آنکھوں میں گھومنے لگیں - ابو صالح اصلاحی سے جو آخری معانقہ کیا تھا معاً نگاہوں میں پھر گیا - ایک تصویر سامنے آ گئی - ان کی آخری تصویر ——————— ہنس مکھ ، خوب رو ، گندمی رنگ ، موٹی موٹی آنکھیں ، کٹار سی ناک ، کھلا ماتھا ، - پہلے اچکن پہنتے اب سوٹ پہننے لگے تھے - قامت میانہ سے کچھ کم ہی تھی - البتہ بدن کی ضخامت بڑھ گئی تھی - افسوس یہ دن ان کی موت کے نہیں تھے - لیکن دیکھتی آنکھوں ہوا ہوگئے - نظامی صاحب کا انتقال ہوا تو راولپنڈی سے لاہور پہنچے - جنازہ جا رہا تھا - راستہ بھر زار و قطار روتے رہے - بڑی دیر میں دل سنبھلا - طبیعت کئی روز مضمحل رہی - چونکہ تمام دوستوں میں کم عمر تھے - اس لئے ہم انہیں عموماً چھیڑا کرتے - میاں ہم لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے تو ہمارے محاسن و محامد پر مقالہ ضرور لکھنا - تصویر ضرور چھاپ دینا - بس میں ہو تو نمبر بھی نکالنا - وہ ہنس دیتے - غضب کرتے ہو بھائی ! آپ لوگ ابھی کہاں مرتے ہیں - ابھی تو ہم نے

زندگی کا سفر شروع کیا ہے - لیکن یہ انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ جس سفر پر جا رہے ہیں وہ آخری سفر ہے - وہ قاہرہ نہیں عدم آباد جا رہے تھے - اور ان کی جواں مرگی کا ماتم ہمارے ہی مقدر کا نوشتہ تھا - - - - -

ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

مجید لاہوری

خدا بخشے، مجید لاہوری صحافت میں شعلۂ مستعجل تھے۔ مشق تو مدت سے کر رہے تھے لیکن پاکستان بن جانے کے بعد چمکے اور ستارہ ہو گئے۔ ''جنگ'' کی اشاعت اور ان کی شہرت کراچی میں چارکھونٹ پھیل گئی۔ اخبار نویسی کے اس شباب کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ نو دس سال میں سفر پورا ہو گیا۔ اور وہ معبود حقیقی سے جا ملے۔ سینتالیس برس کے لگ بھگ جئے۔ ۱۹۱۳ء میں گجرات کے ایک چوھان خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۲۶ جون ۱۹۵۷ء کو کراچی میں پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا۔ عوارض کی پوٹ تھے۔ شراب نے بیماریوں کو پروان چڑھایا۔ کبھی خوف زدہ

ہو کر شراب چھوڑ دیتے - رجوع کرتے تو پھر اُسی کے ہو جاتے -
وہ اہل قلم کے اس قافلے میں تھے جو موت کو شراب کی وساطت سے
پکارتا رہا - اور آخر کار اسی کے ھاتھوں جان ھار ہوگیا - اختر شیرانی
سعادت حسن منٹو، چراغ حسن حسرت، اظہر امرتسری، ایوب کرمانی
ایک ایک کر کے شراب کی بھینٹ ہوگئے - مجید کو بھی پیتے پلاتے
اسی کے ھاتھوں ہلاک ہونا پڑا - اور وہ آناً فاناً لقمۂ اجل ہو گئے -

---

اس عمر، یا خوبی کے لوگ مر جاتے ہیں تو عموماً کہا جاتا ہے
کہ یہ دن اس کی موت کے نہیں تھے لیکن دن تو یکساں ہوتے ہیں
اور موت کا وقت بھی مقرر ہے - پھر جب انسان خود ہی ہلاک ہونے
کا فیصلہ کر لے تو موت کیوں کر ٹل سکتی ہے - مجید ان ایام میں
نہ مرتے تو کب مرتے ؟ حاجی لق لق کی طرح مرتے ؟ کہ شراب
کی گدائی میں بڑھاپا بھی ویران ہو گیا تھا —— ان کی موت سے
کراچی کی اخباری فضا میں خلا ضرور پیدا ہوا لیکن جس ڈگر پر
وہ چل رہے تھے اس راہ پر بگٹٹ ہونے کے بعد ان کے لئے جینا
عبرتناک ہوتا - ان حالات میں موت نے انہیں صحیح وقت پر انتخاب
کیا - البتہ انہوں نے موت کو صحیح طریق سے انتخاب نہیں کیا تھا -
انسان قضا سے کھیلنا شروع کر دے تو اس سے بچنا محال ہو جاتا
ہے - مجید نے کراچی کو لہو و لعب کے ساتھ اپنا لیا تھا - ظاھر
ہے اس لہو و لعب کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا -

ہم نے پچھلے پچیس تیس برس میں قلم کے کھلاڑیوں کو شراب

کی زد میں آ کر اسی طرح مرتے پایا ہے۔ ظاہر ہے کہ فطرت اہل قلم کے لئے اپنا قانون نہیں بدلتی جو اس رنگ میں مرنا چاہے۔ موت اس کے لئے زندگی کا سفر اور بھی مختصر کر دیتی ہے اور وہ دیکھتی آنکھوں رخصت ہو جاتا ہے۔ مجید مر گئے تو یہ اٹل تھا۔ موت ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ فرق یہ پڑتا ہے کہ بعض لوگ طبعی عمر گذار کے مرتے ہیں بعض اچانک مر جاتے ہیں۔ بعض گویا پیدا ہی موت کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ زندگی کی اہانت کر کے موت کے غار میں کود پڑتے ہیں۔ مجید اس آخری گروہ کے فرد تھے۔ممکن ہے کچھ دنوں اور زندہ رہ جاتے لیکن شراب اور اس کی حواری عادتوں نے انہیں جلد ہی اُٹھا لیا اور وہ آناً فاناً چت ہوگئے۔ پسماندگان میں صرف ایک اہلیہ تھی اس کے لئے پس انداز کر چکے تھے۔ اولاد ہوتی تو اہلیہ کو ٹھوکریں کھانی پڑتیں۔ پھر جانے کہاں کہاں کشکول اُٹھا کر پھرتیں۔ یار لوگ اپیلیں کرتے کچھ ان کے بچوں کو کھلاتے کچھ آپ کھا جاتے۔ جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے تو یہ تصویریں مدھم ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ خطوط بھی اُڑ جاتے۔ رفتہ رفتہ طاق نسیاں کا ایک گلدستہ تیار ہو جاتا۔ جس کے کھلنے اور مرجھانے کا پتہ ہی نہیں چلتا ——— ان کی موت سے نقصان یہ پہنچا کہ جس زبان اور جس میلان سے وہ معاشرہ اور اس کے اداکاروں پر تنقید کرتے تھے اس تنقید کی آج ضرورت تھی۔ اور یہی زمانہ اُن سے خالی ہو گیا۔

تعلیم کیا تھی معلوم نہیں ؟ لیکن پہلے پہل انہوں نے کراچی ہی میں قلم گھسانا شروع کیا کسی دوسری زبان میں شد بد نہ تھی۔ بس اُردو ہی جانتے تھے۔ اسی میں نام پیدا کیا۔ سندھ کے دارالحکومت کراچی میں تقسیم سے پہلے اُردو کا اخبار نویس ہونا مشکل نہ تھا۔ چھوٹے موٹے ہفتہ وار، ضمیمہ نما روزنامے، پتھر کی چھپائی، پانچ سو تک اشاعت، ہماں شماں رئیس التحریر ہو جاتا تھا۔ مجید لاہوری تب کراچی کے انہی "رقم طرازوں" میں تھے۔ ۱۹۴۶ء کی دوسری ششماہی میں کسی طرح لاہور آ گئے۔ یہاں انہیں سید عطا اللہ شاہ بخاری کے ہاں دیکھا۔ تعارف ہؤا۔ کہ مجید لاہوری ہیں۔ اور کراچی کے اخباروں میں ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ معلوم ہوا کہ گوجرانوالہ کے ہیں۔ لاہوری کیوں لکھتے ہیں؟ سنا نہ پوچھا پیدائش گجرات کی۔ پڑھائی، لکھائی اور کمائی کراچی کی۔

لاہور میں تو چھ سات مہینے رہے ہونگے۔ وہ بھی ان دنوں جب پنجاب تقسیم ہو رہا اور صوبہ بھر میں فسادات کا زور بندھا ہوا تھا۔ میں ان دنوں "آزاد" کا ایڈیٹر تھا۔ اور مجید ادارہ میں مطائبات نویس کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔ فکاہی کالم لکھنا شروع کیا۔ لیکن جم نہ سکا۔ اس زمانہ میں الفاظ کے ہیر پھیر سے مزاح پیدا کرتے لیکن ظرافت کا صحیح ذوق نہ تھا۔ ایک روز پتہ چلا کسی مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے کراچی چلے گئے اور ہفتہ بھر کے کالم لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا جائزہ لیا تو الفاظ سے گلی ڈنڈا کھیلا ہوا تھا۔ میں نے اشاعت روک دی۔ واپس آئے تو شکوہ

کیا۔ ایک روز الگ ہو گئے۔ بلکہ روٹھ کر کراچی لوٹ گئے۔ پاکستان بنا تو میر خلیل الرحمٰن نے ''جنگ'' میں حرف و حکایت لکھنے پر لگا دیا۔ یہ اصل آغاز تھا ان کے کالم نویس ہونے کا! دنوں ہی میں معروف ہو گئے۔ کراچی میں ان کے مزاح کا طوطی بولنے لگا۔ اپنا ہفتہ وار ''نمکدان'' نکالا۔ نتیجۃً اور بھی شہرت ہو گئی بلکہ جو شہرت کما چکے تھے نمکدان کی فروخت کا ذریعہ ہو گئی۔ دنوں ہی میں کراچی اُن کی اور وہ کراچی کے ہو گئے۔ تمام محفلوں میں مدعو کئے جاتے۔ وزراء شیدائی، حکام دلدادہ، سیٹھ فریفتہ، مہاجر گرویدہ، مقامی رطب اللسان، غرض بت خانے سے لے کر مے خانے تک اور قصر حکومت سے لے کر بازار سیاست تک بے روک ٹوک آتے جاتے۔ وزیروں اور فقیروں میں محاورۃً نہیں بلکہ واقعۃً مقبول تھے۔ جتنا حکومت کے وزراء انہیں چاہتے تھے اتنا ہی رکشا کے ڈرائیوروں میں عقیدت و ارادت کا مرجع تھے۔ جنگ میں حرف و حکایت کا عوامی مزاح، نمکدان کی ظریفانہ چھیڑ چھاڑ، مشاعروں میں طربیہ کلام، نظیر اکبر آبادی کی بحروں میں طبع آزمائی، بعض اشعار سے پرانے الفاظ اُٹھا کر نئے الفاظ ٹانکنا، جس سے مشاعرہ زعفران زار ہو جاتا پھر ان کی اپنی وضع قطع جیسے کوئی ضخیم کتاب ہو۔ ان سب چیزوں نے انہیں خواص و عوام کا مرجع بنا دیا تھا۔ وہ ادبی انداز کے نکتہ آفرین نہیں تھے لیکن بات سے بات اُٹھا کر مزاح پیدا کرتے جس سے قاری یا سامع لوٹ پوٹ ہو جاتا غرض صحیح معنوں میں وہ ایک عوامی مزاح نگار تھے۔ کہ ثقہ سے ثقہ

آدمی بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ۔ ان کا طرز سخن اور طرز مزاح ہمعصروں سے مختلف تھا ۔ کچھ لفظ تھے جن سے انہیں لگاؤ تھا ان کے کردار بھی خاص لوگ تھے مثلاً رمضانی ، سائیں سلیمان بادشاہ ، مولوی گل شیر خاں ، سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی ، بندو خاں ، جمن شاہ برساتی ، تجوری بھائی بنک بیلنس جی ، اور شیخ حمار اللہ یہ گویا ان کی تحریروں کے ہیرو تھے ۔ جن کی آڑ میں وہ معاشرے کے مختلف روگوں پر حملہ آور ہوتے اور طعن توڑتے تھے ۔ رمضانی کا نام لے کر محنت کشوں کی حمایت کرتے اور سرمایہ داروں کو لتاڑتے تھے ۔ مولوی گل شیر خاں ان کے نزدیک مقدس دلال تھا ۔ جو منبر و محراب پر فروکش ہوکر مذہب فروشی کرتا اور سرمایہ داروں کا گماشتہ تھا ۔ سائیں سلیمان بادشاہ کراچی کا ایک مجذوب تھا لیکن ان کے ہاں اس کا تصور ایک ایسے ملنگ کا تھا جس کے دامن میں ہوتا ہواتا کچھ نہیں مگر لوگ اس کی کرامت یا استدراج سے متاثر ہوتے ہیں ۔ ٹیوب جی ٹائر جی اس کے نزدیک بلیک مارکیٹنگ اور سمگلنگ کا دیوتا تھا ۔ جس کا نصب العین محض دولت کا حصول ہو ۔ بقول مجید اس کی ٹانگیں پتلی اور پیٹ پھولا ہوا ہوتا ہے ۔ بنک بیلنس جی اور تجوری بھائی اس دیوتا ہی کا توام بھائی ہمزاد یا ہم زلف ہے جو عوام کا خون نچوڑ کر اس سے جانی واکر بناتا ہے ۔ بندو خاں اس کے لغت میں ان کارکنوں اور جرنلسٹوں کا نام تھا جو کماتے تھوڑا اور لٹاتے زیادہ ہیں ۔ جن کی طبیعتیں فراخ لیکن ھاتھ تنگ ہوتے ہیں ۔ جمن شاہ ایک مقامی لیکن مضحک کردار

تھا - حمار اللہ ایک بکی انسان جس کے نام سے لقمہ توڑ اور نوالہ چور انسانوں کا مذاق اڑاتے تھے - ان کرداروں میں شہرت صرف چار کو ہوئی - رمضانی ، سائیں سلیمان بادشاہ ،مولوی گلشیر خان اور سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی — لیکن مجید کی رحلت کے بعد ان کرداروں کا بھی خاتمہ ہوگیا - اس کی بڑی وجہ مجید کے ادب کی عموسی سطح اور ظرافت کا وقتی اُبال تھا - یہ کہنا تو غلط ہے جیسا کہ ان کے ایک سیرت نگار نے لکھا ہے کہ وہ رشید احمد صدیقی ، احمد شاہ بخاری پطرس ، چراغ حسن حسرت اور کنہیا لال کپور کی صف کے مزاح نگار تھے - لیکن بالطبع مزاح نگار ہی تھے- چھوٹے چھوٹے جملے، ہلکا پھلکا انداز ، میٹھا میٹھا مزاح اور دھیمی دھیمی طنز گویا ان کی تحریر کا خمیر و فطیر تھا -

رشید احمد صدیقی کا طنز شاہانہ ہے- وہ انشا کے فرمانروا ہیں - لیکن ان کی فرمانروائی میں صدیق اکبرؓ کی للھیت اور عمر فاروقؓ کی سطوت ہے - احمد شاہ بخاری ظرافت میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سلطان قطب الدین ایبک کی ہے - چراغ حسن حسرت مٹیا محل یا قلعہ معلیٰ کے شرفاء میں شمار کئے جا سکتے ہیں کنہیا لال کپور کے مزاح میں چابک دستی ہے - شوکت تھانوی لکھنوی زبان کے اُجڑے ہوئے عیش کی تصویر تھے - مجید کو اس قبیلہ سے وہی نسبت تھی جو غالب کو ذوق سے ہے - ان کا نشانہ کچھ اور ہی لوگ تھے - انہیں زبان کی رنگینی یا سنگینی میں دسترس نہ تھی کراچی کی اردو میں چھیڑ چھاڑ کرتے - لکھنؤ کے

رنگ میں کنکوے اڑاتے اور اس طرح پیچ لڑا کر '' وہ کاٹا '' کا مزہ لوٹتے تھے - کہتے ہیں قلعہ معلیٰ لٹ گیا تو شہزادے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کٹورہ بجاتے تھے مجید کا اسلوب بھی کچھ ایسا ہی تھا -

---

عبد المجید سالک سے تلمذ تھا - انہیں پیر و مرشد کہتے - سالک واحد شخص تھے جن کے بارے میں وہ ظاہر و باہر مخلص تھے - ورنہ سبھی دوستوں کے معاملہ میں بہ قول شفیع عقیل '' فکاہات نویسی '' ضرور کرتے تھے -

سالک اردو صحافت میں طنز و مزاح کے شہسوار تھے - '' افکار و حوادث '' کے کالم نے ان کی دھاک بٹھا دی تھی - مجید نے ان سے کیا فیض پایا ؟ معلوم نہیں - لیکن دونو کے طنز و مزاح میں ہر لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے - ہاں ! شاعری میں ان سے مشورہ لیا ہو تو الگ بات ہے بہر حال مجید انہیں اپنا استاد مانتے اور وہ انہیں کراچی میں اپنا خلیفہ گردانتے تھے -

سالک مرحوم کے شاگردوں میں دو نوجوانوں نے بڑا نام پیدا کیا - احمد ندیم قاسمی اور مجید لاہوری لیکن دونو کے مطائبات میں سالک کا رنگ نہیں - دونو اپنا ہی اسلوب رکھتے ہیں - احمد ندیم قاسمی قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ نثر میں بھی ایک خاص شیوہ رکھتے ہیں - سالک کی ظرافت یا صحافت سے انہیں کوئی علاقہ نہیں - لیکن سالک کا شاگرد ہونے پر انہیں فخر ہے اور اس کا اعتراف انہوں

نے ''جلال و جمال'' کے انتساب میں کیا ہے۔

مجید کو شراب کہاں سے لگی؟ شفیع عقیل نے اختر شیرانی کو مسئول ٹھہرایا ہے لیکن میرا خیال ہے یہ محض افسانہ ہے۔ مجید لاہوری اور اختر شیرانی میں سرے سے رسم و راہ ہی نہ تھی۔ شاعروں کو شراب لگتے کیا دیر لگتی ہے؟ مشاعرے شروع کئے تو شراب بھی شروع ہوگئی۔ سالک صاحب سے ان کے تعلقات کا آغاز غالباً گوجوانوالہ میں ''پنچایت'' یا ''دیہات سدھار'' کی ملازمت سے ہوا کیونکہ انہی کی سفارش پر ملازم ہوئے تھے۔ نوکری معمولی تھی۔ جلد ہی سرکار کا پنڈ چھوڑ کر لاہور آ گئے اور یہاں نوکری ڈھونڈھتے رہے احرار راہنماؤں سے عقیدت تھی آزاد میں شامل ہو گئے لیکن طبیعت کی اُڑانوں کے باعث الگ ہونا پڑا۔ شراب دراصل کراچی میں شروع کی۔ پھر جب معیشت کا اضطراب جاتا رہا۔ ''جنگ'' سے معقول مشاہرہ ملنے لگا۔ ''نمکدان'' چل نکلا تو روپے پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔ دولت مندوں کا نگر شراب پلانے والے عام ہر روز حکام و امرأ کے ھاں دعوتیں۔ جرنلسٹوں کے لئے خم کے سر بہ مہر ہونے کا اندیشہ کہاں؟ رفتہ رفتہ خون پانی اور شراب ایک ہو گئے۔ ہم مذاق دوست آن واحد میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت کراچی میں وارد ہوگئے۔ ریڈیو میں ذوالفقار علی بخاری موجود تھے غرض ہم نوالہ و ہم پیالہ دوستوں کا ایک مجمع ہو گیا۔ افسروں اور جرنلسٹوں کو پلانے والے ایک نہیں سینکڑوں ہوتے ہیں۔ مجید لاہوری اور

حسرت صبح و شام شراب ہی کے ہو گئے - حتیٰ کہ ناشتہ بھی شراب ہی سے کرتے تھے - شرابی عموماً رقیق القلب ہوتا ہے - جس کثرت سے شراب پیتا اسی نسبت سے اس کا دل نرم پڑ جاتا ہے -

مجید ڈٹ کر پیتے اور دل کھول کے روتے تھے - آخری دنوں میں گھنٹہ دو گھنٹہ لکھنا - بارہ گھنٹے پینا - چھ گھنٹے رونا اور چار گھنٹے سونا ان کا معمول ہو چکا تھا - پڑھنے پڑھانے کا شوق انہیں مطلقاً نہیں تھا - وہ کتابوں کی بجائے محفلوں کے مطالعہ و مشاہدہ کی بنا پر لکھتے تھے - قدماء سے کچھ زیادہ شناسا نہیں تھے - غالب کا دیوان پڑھا نہیں - اشعار سن رکھے تھے - اقبال کو بھی سن ہی رکھا تھا - اکثر لوگوں کی طرح کلام اقبال کے تیر و نشتر یاد تھے اکبر الہ آبادی اور حسن نظامی کو پڑھتے رہے - نظیر اکبر آبادی کا دیوان بستر میں ساتھ رکھتے تھے - سونے سے پہلے ورق گردانی کی - کوئی مصرع بھلا معلوم ہوا - طبیعت حاضر ہو گئی تو شعر کہنے لگ گئے - ورنہ چادر تان کر سو جاتے - سید عطا اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے شیدائی تھے - شاہ جی کراچی جاتے تو ان سے ملنے کے لئے التزاماً حاضر ہوتے - ایک دفعہ ان کی تقریر سنانے کے لئے خواجہ شہاب الدین کو بھی آرام باغ میں لے گئے - شاہ جی بھی ان کے قہقہوں اور لطیفوں سے بے حد محظوظ ہوتے تھے - مجید کو شاہ جی سے بلا کا عشق تھا - ان کے سامنے صرف پان کھاتے سگریٹ نہیں پیتے تھے - شاہ جی کو آخر وقت تک معلوم نہ ہو سکا کہ مجید شراب پیتا ہے -

---

ان کی بلا نوشی کے واقعات تو بارہا سنے تھے لیکن دیکھا ایک آدھ دفعہ ہی تھا ۔ سکندر میرزا نے بعض ایڈیٹروں کو کھانے پر مدعو کیا ۔ میں بھی انہی میں شامل تھا ۔ میرزا بڑے ٹھاٹھ سے برآمد ہوئے ۔ اگاڑی پچھاڑی حاجب و دربان ۔ رسمی تشریف آوری کے بعد سبھی لوگ آپس میں گھل مل گئے ۔ سکندر میرزا دھت ہو کے آئے تھے ۔ ایڈیٹروں کے لئے کھانا چن دیا گیا ۔ مجید نے قہقہہ لگایا ۔ سکندر میرزا نے مجید کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔

"مجید کیا ارادہ ہے" ؟

"ارادہ تو ٹھیک ہے لیکن اس بے مزہ دعوت کا فائدہ ؟"

"بھئی یہ آپ لوگوں میں ریشائل قسم کے لوگ بھی ہیں"

"اجی ان پر تین حرف بھیجو ۔ ان کی ڈاڑھیاں بھگو دو"

مجید اس وقت بھی پیئے ہوئے تھے میرزا نے اشارہ کیا ۔ خم آ گئے ۔ مجید لاہوری کے لئے گورنر جنرل کی قیمتی شرابیں ۔ گویا رزق حلال ہو گئیں ۔ دیکھتی آنکھوں سالم بوتل چڑھا گئے ۔ میرزا ، مجید کی ہتھیلیاں سہلا رہا اور مجید قہقہے چھوڑ رہا تھا یہ گویا پاکستان کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے قصر حکومت کا "زہد و تقویٰ" تھا ۔

احسان دانش کسی شہر کے مشاعرے کا ذکر کر رہے تھے ۔ کہ وہاں ترقی پسند نوجوانوں نے شراب میں بہک کر مذہب پر حملے شروع کئے ان کی گستاخیاں حضورؐ کے دامن سیرت تک آ ہی رہی

تھیں مجید نے فوراً ٹوک دیا۔ اس وقت وہ شراب میں چور تھا اس نے خبردار کا نعرہ بلند کیا اور اشتمالی شاعر مہر بلب ہو کر رہ گئے۔ احسان صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بعد مجید رات بھر روتا رہا وہ ایک لحظہ کے لئے سویا ہی نہیں۔ میں نے بہت کوشش کی اس کی آنکھ لگ جائے لیکن وہ روتا رہا اور چیختا رہا ــــــــ

"ان بدزبانوں کی اتنی جسارت ہوگئی ہے کہ حضور ؐ پر زبان درازی کریں۔ انہیں معلوم نہیں یہ اسلامی معاشرہ ہے۔ یہاں اسلامی حکومت ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ لاکھ گنہگار سہی، شرابی سہی، لیکن ہمارے سامنے انہیں ژاژ خائی کا حوصلہ کیونکر ہوا؟ ہم قیامت کے دن حضور ؐ کو کیا منہ دکھائیں گے؟ ہم عاصیوں کے واحد سہارا وہی ہیں۔ ان کی شفاعت ہی تو ہمارے کام آئے گی۔ ورنہ ہماری بخشش کا سر و سامان ہی کیا ہے۔"؟

مجید نے مجھ سے خود بھی یہ واقعہ بیان کیا۔ حضور ؐ کا ذکر آتے ہی وہ اشکبار ہو جاتا۔ شاہ جی کی ہم صحبتی کا اس پر بے حد اثر تھا آخرت میں ان کی بخشش کے لئے یہی کافی ہے۔

وہ ترقی پسند شعراء سے ہمیشہ ہی برگشتہ رہا اس کا بیان تھا کہ اشتمالی شاعروں کی کھیپ میں توحید و رسالت کے لئے احترام نہیں۔ اللہ کو گالی دینا ہو تو مشیت پر طعن کرتے ہیں۔ رسالت کے خلاف کھل کے کہہ نہیں سکتے کہ مسلمانوں کے جذبات کی گرفت سے ڈرتے ہیں۔ لیکن تنہائی میں تعریض کرنے سے چوکتے نہیں۔ کوئی ٹوک دے تو سہم جاتے ہیں ــــ مجید سیاسیات میں کسی نظریے کے

پیرو نہ تھے ۔ البتہ سرمایہ و محنت کی طبقاتی کشمکش کا انہیں احساس تھا ۔ ''حرف و حکایت'' میں جب اس پر قلم اٹھاتے تو نظام زر اور اس کے مظاہر و آثار کا مذاق اڑانا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔

ان کے پاس قہقہے تھے یا لطیفے ۔ گرہ سے خرچ کرنا نہیں جانتے تھے ۔ کبھی کبھار اچکن پہن لیتے ورنہ کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور کھلے گلے کا کرتہ پہن کر کراچی میں اڑے پھرتے تھے ۔ ان کا فربہی جسم اور چہرہ مہرہ ہی کچھ ایسا تھا ۔ کہ لوگ ان پر ایک نگاہ ضرور ڈال لیتے یہ جان کر کہ مجید لاہوری ہیں کراچی کے عوام پیار سے دیکھتے مجید خوش ہوتے مثلاً کسی راہگیر نے ساتھی سے کہا ۔

" وہ دیکھو مجید لاہوری جا رہا ہے ۔''

تو اس کا انہیں پہروں نشہ رہتا ۔ دوستوں سے کہتے یہ اللہ کی دین ہے کہ لوگ جانتے پہچانتے اور عزت کرتے ہیں ۔ بعض ان پڑھ قسم کے لوگ انہیں دادا سمجھتے ۔

" دادا سلام ''

ظاہر ہے کہ دادا نامور بد معاش کو کہتے ہیں ۔ لیکن وہ اس کو ناخواندہ لوگوں کی ارادت پر محمول کرتے ایک روز ہم دونو فریئر روڈ سے بندر روڈ کی طرف آ رہے تھے ایک شخص نے جو نظر بہ ظاہر میمن معلوم ہوتا تھا ۔ ان سے مصافحہ کیا ۔ پھر کان میں کچھ کہا ۔ مجید لوٹن کبوتر ہو گئے ۔

میں دلال نہیں مجید لاہوری ہوں۔

شخص مذکور نے ایک بھرپور نگاہ سے دوبارہ جائزہ لیا پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اُڑ گیا۔

مجید کون تھا یہ؟

لا حول ولا قوۃ، پاگل دا بچہ (یہ ان کا تکیہ کلام تھا) سٹہ باز تھا۔ مجھ سے سٹہ پوچھتا تھا۔ غور کرو۔ کراچی ہے کہ قمار بازوں کا نگر، یہاں مسجدیں بھی سٹہ پر بنتی ہیں۔ کاروبار تو ہے ہی سٹہ۔
"مجید بھائی بظاہر تو سٹہ باز ہی معلوم ہوتے ہو کہیں "دڑا" تو نہیں نکالتے ہو"
"او جی مٹی پاو، لعنت بھیجو"
یہ بھی ان کا تکیہ کلام تھا

رکشا والا انہیں دیکھ کر شاذ ہی رکتا تھا۔ بعض نستعلیق رکشا والے مذاق بھی کر جاتے مثلاً ایک دفعہ بہادر شاہ ظفر مارکیٹ سے برنس روڈ پر جنگ کے دفتر میں جانا چاہتے تھے۔ خالی رکشا آ جا رہے تھے وہ پکار رہے ہیں۔

اے لڑکے ذرا رکنا؟

لیکن لڑکا ایک نگاہ ڈال کر نکل جاتا ہے۔

ایک نو جوان رک گیا۔

کہاں جاؤ گے سیٹھ صاحب ؟

سیٹھ صاحب ؟ مجید نے حیرت سے کہا ۔ بھائی ہم تو مزدور ہیں ۔

'' تو معاف کیجئے مزدور کے لئے یہ رکشا نہیں ہے ۔ پیدل جاؤ ۔'' اور رکشا والا ایڑ لگا کر فروٹ ہوگیا ۔ ایک اور رکشا روکا

کہاں ؟

برنس روڈ ۔

معاف کیجئے آپ کو ایک پھیرے میں لے جانا مشکل ہے ۔ ۔ ۔ یہ جا وہ جا ۔ رشید اختر ندوی اور مجید دونوں ہم وزن تھے ۔ ندوی قد آور لیکن وزن دونوں کا ایک ہی تھا ۔ دونوں رکشا میں سوار ہو گئے ۔ رکشا والا کی سانس پھول گئی ۔ تو بھی وہ ھانپتا کانپتا رکشا لئے جا رہا تھا ۔ خون پسینہ ایک ہوگیا ۔ مجید کو راستہ میں کسی نے ھاتھ دے کر روکا اور وہ رک گئے ۔ رشید اختر ندوی بھی اُتر کر ملاقاتی کی طرف بڑھے ۔ رکشا والے نے غنیمت جانا ۔ پیڈل پر پاؤں مارا اور بھاگ نکلا ۔ مجید نے بھاگتے دیکھا تو پکار کر کہا ۔

ارے بھائی ! کہاں جا رہے ہو ؟ پیسے تو لے جاؤ ۔ رکشا والے نے مڑ کر صدا دی ۔

'' صاحب اگر زندگی ہے تو کہیں اور سے کما لوں گا '' رکشا! گدھے کا بوجھ اُٹھانے کے لئے نہیں ہے ۔

جن الاؤ تلاوں میں ڈوب گئے تھے ان کے باعث موت تو یقینی تھی ۔ لیکن تھی اچانک۔ انفلوئنزا ہوا قدرے آرام آ گیا۔ غسل خانے میں جا کر ٹھنڈے پانی سے نہا لئے۔ حالانکہ نہانے میں کچھ زیادہ با حوصلہ نہیں تھے لیکن ان کا یہ غسل آخری ثابت ہوا۔ اگلے روز غسل میت دیا گیا۔ اور وہ شخص ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہوگیا۔ جس سے محفلوں میں رونقیں ، عشائیوں میں قہقہے ، عصرانوں میں لطیفے ، دوستوں میں ولولے اور اخباروں میں چہچہے تھے۔ پامال مصرعے بھی کبھی کبھار کسک پیدا کر جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ع

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ادبی حلیہ یہ تھا۔

قد دو جلدوں میں ۔ ضخامت کے اعتبار سے طلسم ہوشربا ۔ بال کبھی مختلف البحر مصرعے ہوتے کبھی اشعار غزل کی طرح مربوط ۔ آنکھیں شرابی تھیں اور گلابی بھی ۔ لیکن انہیں خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا ۔ چہرہ کتابی تھا ۔ ناک ستواں ۔ ماتھا کھلا لیکن اتنا کشادہ بھی نہیں کہ ذہانت کا غماز ہو۔ مسکراتے بہت تھے معلوم ہوتا لالہ زار کھلا ہوا ہے یا پھر رم جھم بارش ہو رہی ہے ۔ اچکن پہن کر نکلتے تو معلوم ہوتا کہ گرد پوش چڑھا ہوا ہے۔ ورنہ سیدھے سادے اور موٹے جھوٹے کپڑوں میں اکبری منڈی لاہور کے بیوپاری معلوم ہوتے تھے ۔ عمر بھر اپنی ہی ذات میں مگن رہے۔ کسی انجمن ستائیش باہمی سے رابطہ پیدا کیا نہ ایسی کسی انجمن کے رکن رہے ۔ وہ ان جھمیلوں سے بے نیاز تھے ۔ ان کا اپنا وجود

ایک انجمن تھا ۔ وہ عوام کی قدر شناسی کو اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتے تھے۔ پیدل چلنا ان کے لئے دوبھر ہوتا ۔ تھوڑی دیر چل کر سواری کی راہ تکنے لگتے۔ رکشا والے انہیں بٹھاتے ہوئے اختلاج قلب محسوس کرتے ۔ نتیجۃً ------- ع

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

کل کلاں ہم میں تھے تو احساس ہی نہیں تھا کہ وہ بھی ہیں ۔ آج اوجھل ہو گئے ہیں تو اپنے ہی جی سے سوال کر کے پریشانی ہوتی ہے -------- ع

یا رب یہ بستیاں اب کس دیس بستیاں ہیں

مطبوعہ چٹان پرنٹنگ پریس لاہور